اردو تحقیق اور ادبی مجلے: ادبیات اور الاقرباء کا تنقیدی مطالعہ

۲۰۱۵ء تا ۲۰۲۰ء

مقالہ

برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

نائلہ عنبرین

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۳ء

اردو تحقیق اور ادبی مجلے: ادبیات اور الاقرباء کا تنقیدی مطالعہ

۲۰۱۵ء تا ۲۰۲۰ء

مقالہ نگار

نائلہ عنبرین

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

© نائلہ عنبرین

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: اردو تحقیق اور ادبی مجلے: ادبیات اور الاقرباء کا تنقیدی مطالعہ ۲۰۱۵ء تا ۲۰۲۰ء

پیش کار: نائلہ عنبرین **رجسٹریشن نمبر:** 1MPhil/Urd/S20

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو زبان وادب

ڈاکٹر رخشندہ مراد ______________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ______________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

تاریخ: ______________________

اقرارنامہ

میں نائلہ عنبرین حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز اسلام آباد کے ایم۔فل اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔میں نے یہ کام کسی اور ادارے یا یونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

نائلہ عنبرین

مقالہ نگار

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	xiv
اظہارِ تشکر	xv
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیان مسئلہ	۱
iii. مقاصد تحقیق	۲
iv. تحقیقی سوالات	۲
v. نظری دائرہ کار	۲
vi. تحقیقی طریق کار	۳
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۳
viii. تحدید	۳
ix. پس منظری مطالعہ	۳
x. تحقیق کی اہمیت	۴
(ب) صحافت اور ادبی صحافت	۴
۱. معنی و مفہوم	۴
۲. ادبی مجلوں کی روایت کا پس منظری مطالعہ	۷

۳. سہ ماہی ادبیات کا آغاز و ارتقا ۱۱

۴. سہ ماہی الاقرباء کا آغاز و ارتقا ۱۳

(ج): مشتملاتی تجزیہ ۱۴

ا۔ تجزیہ مشتملات کی تاریخ ۱۶

حوالہ جات ۲۱

باب دوم: ادبی مجلوں میں نثری مقالات / آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ (۲۰۱۵ء تا ۲۰۲۰ء) ۲۳

الف: افسانوی نثر پر مبنی تحقیقی و تنقیدی تحریریں (ادبیات) ۲۳

ا۔ افسانے پر مبنی آرٹیکل (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۲۳

i. سیاست ۲۳

ii. معیشت ۲۵

iii. معاشرت / سماج ۲۶

iv. تہذیب ۲۸

v. نفسیات ۲۹

vi. وجودیت ۳۱

vii. جدیدیت ۳۴

viii. نو آبادیات ۳۴

ix. رومانیت ۳۵

x. اسلوب ۳۵

۲۔ ناول: ناول پر مبنی آرٹیکل (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۳۶

i. مابعد الطبیعات ۳۶

ii. معاشرت / سماج ۴۱

iii.	تہذیب	۵۱
iv.	معیشت	۵۴
v.	سیاست	۵۵
vi.	دہشت گردی	۶۲
vii.	آدرش پسندانہ رویہ	۶۲
viii.	نفسیات	۶۲
ix.	نوآبادیات / مابعد نوآبادیات	۷۵
x.	ردنوآبادیات	۷۵
xi.	تانیثیت	۷۶
xii.	وجودیت	۸۲
xiii.	لایعنیت	۸۴
xiv.	عدمیت	۸۴
xv.	تاریخیت ونوتاریخیت	۸۵
xvi.	جدیدیت	۸۵
xvii.	مابعد جدیدیت	۸۸
xviii.	ماحولیات	۹۰
xix.	تاریخ	۹۱
xx.	ترقی پسندی	۹۶
xxi.	رومانیت	۹۷
xxii.	تقابل	۹۹
xxiii.	ہئیتی طریقہ کار	۹۹
xxiv.	اسلوب	۱۰۲
ب۔	**غیر افسانوی نثر پر مبنی تحقیقی و تنقیدی تحریریں**	۱۰۷
	ا۔ سوانح عمری / آپ بیتی	۱۰۷

i. مدح نامہ ۱۰۷
ii. تاریخ ۱۰۸
الاقرباء: ا۔افسانے پر مبنی آرٹیکل(افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۱۰۹
i. معیشت ۱۰۹
ii. معاشرت / سماج ۱۰۹
iii. موت ۱۱۰
iv. تہذیب ۱۱۰
v. نفسیات ۱۱۱
vi. تانیثیت ۱۱۲
vii. جدیدیت ۱۱۳
viii. تاثرات ۱۱۳
ix. تقابل ۱۱۴
x. اسلوب ۱۱۴
xi. ساختیات ۱۱۴
xii. رومانیت ۱۱۵
۲۔ناول: ناول پر مبنی آرٹیکل(افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۱۱۵
i. مابعد الطبیعات ۱۱۵
ii. سیاسی و سماجی ۱۱۶
iii. تہذیب ۱۱۶
iv. تانیثیت ۱۱۶
۳۔ڈرامہ: ڈرامے پر مبنی آرٹیکل (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۱۱۷
i. سماج ۱۱۷
ب۔ غیر افسانوی نثر پر مبنی تحقیقی و تنقیدی تحریریں ۱۱۷

الف۔ سوانح عمری / آپ بیتی: (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۱۱۷

i. تاریخ ۱۱۷

ب۔ سفر نامہ: (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۱۱۸

i. معاشرت / سماج، تہذیب، ثقافت ۱۱۸

ii. وطن پرستی ۱۱۸

iii. تاریخ ۱۱۸

ج۔ طنز و مزاح: (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۱۲۰

i. تاریخی تحقیق ۱۲۰

د۔ کالم نویسی: (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۱۲۱

i. معاشرت / سماج ۱۲۱

باب سوم: لسانیات اور تحقیق و تنقید پر مبنی مقالات / آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ (ادبیات) ۱۳۰

الف۔ لسانیات ۱۳۰

i. اردو میں مستعمل فارسی روزمرہ ۱۳۰

ب۔ ادبی تحقیق و تنقید (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۱۳۰

i. تصوف ۱۳۰

ii. سماجی شعور ۱۳۱

iii. حالی / مقدمہ شعر و شاعری ۱۳۱

iv. متن کی تدوین ۱۳۲

v. فلسفہ جمالیات ۱۳۲

vi. مادیت پسندی ۱۳۳

vii. اسلوب ۱۳۳

viii. تاریخ ۱۳۴

.ix ادب اور اسلوبیات ۱۳۴

.x مابعد جدیدیت، لبرل علوم اور ڈی کنسٹرکشن ۱۳۵

.xi انتظار حسین ۱۳۵

(الاقرباء) ۱۳۶

الف۔ لسانیات ۱۳۶

.i املا / رسم الخط ۱۳۶

.ii تاریخی تحقیق ۱۳۸

ب۔ ادبی تحقیق و تنقید (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے) ۱۴۰

.i ادب اطفال ۱۴۰

.ii لوک داستانیں ۱۴۰

.iii نراجیت ۱۴۱

.iv نثر غالب ۱۴۱

.v ادبی صحافت / خدمات ۱۴۱

.vi تنقید کے اصول ۱۴۲

.vii تانیثیت ۱۴۲

.viii ساختیات ۱۴۳

.ix روسی ہئیت پسندی ۱۴۵

.x رومانیت ۱۴۶

.xi نفسیات ۱۴۶

.xii سوانحی طریقہ کار ۱۴۶

.xiii تحقیق ۱۴۶

.xiv تقاریز ۱۴۷

.xv تاریخ ۱۴۷

باب چہارم: ادبی مجلوں میں شعری مقالات / آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ	۱۵۰
(۲۰۱۵ تا ۲۰۲۰ء)	
(ادبیات)	۱۵۰
الف۔ نظم: نظم پر مبنی آرٹیکل (افکار و طریقہ کار کے لحاظ سے)	۱۵۰
i. مذہبی شاعری	۱۵۰
ii. ملی شاعری	۱۵۱
iii. انسان	۱۵۱
iv. سیاست	۱۵۲
v. تانیثیت	۱۵۲
vi. ترقی پسندیت	۱۵۲
ب۔ غزل پر مبنی آرٹیکل (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے)	۱۵۲
i. سماج / معاشرت	۱۵۳
ii. عظمت انسان	۱۵۳
iii. حسن عشق	۱۵۳
iv. جدید شاعری	۱۵۵
(الاقرباء)	۱۵۴
الف۔ نظم پر مبنی آرٹیکل (افکار و طریقہ کار کے لحاظ سے)	۱۵۴
i. مذہب	۱۵۴
ii. مابعد الطبیعات	۱۵۷
iii. ملی شاعری	۱۵۸
iv. تصور ارتقا	۱۵۸
v. معاشرت	۱۵۹
vi. تہذیب	۱۶۰

vii.	سیاست	۱۶۱
viii.	انسان	۱۶۲
ix.	تانیثیت	۱۶۲
x.	پس نو آبادیات	۱۶۲
xi.	جدیدیت	۱۶۳
xii.	مابعد جدیدیت	۱۶۳
xiii.	ترقی پسندیت	۱۶۴
xiv.	عمرانیات	۱۶۵
xv.	تاریخ	۱۶۵
xvi.	تاثراتی طریقہ کار	۱۶۶
xvii.	رومانیت	۱۶۷
xviii.	ہئیتی طریقہ کار	۱۶۷
ب۔	**غزل پر مبنی آرٹیکل** (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے)	۱۶۸
i.	مابعد الطبیعات / مذہب	۱۶۸
ii.	عشق حقیقی	۱۶۸
iii.	حسن و عشق	۱۶۹
iv.	عصری شعور	۱۶۹
v.	نفسیات	۱۶۹
vi.	جدیدیت	۱۷۰
vii.	تانیثیت	۱۷۰
viii.	ترقی پسندیت / فلسفہ مادیت	۱۷۱
ix.	رومانیت	۱۷۱
x.	عروض اور تقطیع	۱۷۲
	حوالہ جات	۱۷۳

باب پنجم: ماحصل	۱۷۴
الف۔ مجموعی جائزہ	۱۷۴
ب۔ نتائج	۱۷۵
ج۔ تجاویز	۱۷۷
د۔ سفارشات	۱۷۹
کتابیات	۱۸۰

Abstract

Literary Magazines play an important role in the promotion of research and criticism. These magazines include research and critical articles on language and literature, samples of poetry and prose, literature commentary on books, features on language and literature issues and the writer’s opinion on literary and language situation. Not only do they play an important role in promoting research and criticism, they are also the principal source of research and criticism. These magazines familiarize with new research and critical trends. Literary congregation therefore plays a significant role in promoting literary research with language and literature. Adabyaat and Al-Aqrab are among the literary journals which have produced creative works, research and critical services in the twenty and twenty-first century. This article, “Urdu Research and Literary Journals: Critical Study of Adabiyaat and Al-Aqraba” will highlight the research work of these magazines from 2015 to 2020 using content analysis. As part of this process, the articles in these magazines will be critically examined by methodologically, topic-wise and genre-wise.

اظہارِ تشکر

اس پاک پروردگار کی شکر گزار ہوں کہ جس کے کرم کی بدولت یہ مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔ بلاشبہ یہ ایک کٹھن سفر تھا جو کہ بہت سے مہربانوں کی بدولت طے ہو سکا۔ اس حوالے سے میں شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کی شکر گزار ہوں کہ جن کی بدولت تحقیق کے ہنر سے آشنائی ہوئی۔ مقالے کی تکمیل میں بالخصوص ڈاکٹر رخشندہ مراد کی تہ دل سے ممنون ہوں کہ جن کی رہنمائی نے اس مشکل مرحلے کو آسان بنایا نیز الاقرباء کے مدیر سید منصور عاقل کے فرزند سلمان منصور کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہو گی کہ جنہوں نے بغیر کسی پس و پیش کے الاقرباء کے درکار مجلے فراہم کیے۔

میں اپنی یہ کامیابی اپنے دادا ابو صوبیدار محمد ادریس کے نام کرتی ہوں جو نہ صرف خود علم و ادب کے شیدائی تھے بلکہ مجھے بھی ہمیشہ تلقین کرتے اور حتی الامکان مدد و رہنمائی کرتے۔ آج انہی کی مدد اور دعاؤں کے طفیل میں اس مقام تک پہنچی ہوں کہ ایم فل کے خواب کو حقیقت کا روپ دے سکی ہوں۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

نائلہ عنبرین

ایم۔ فل اسکالر (اردو)

باب اول:

تعارف اور بنیادی مباحث

ا۔ موضوع کا تعارف(Introduction)

ادب کی اشاعت و فروغ میں ادبی مجلوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ ادبی تخلیقات اور تحقیقی و تنقیدی مباحث سب سے پہلے ان ادبی مجلوں کے ذریعے ہی عوام تک پہنچتے ہیں یوں ادبی رسائل زبان و ادب کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ ادبی رسائل نہ صرف ہر طبقے کی بالا امتیاز جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ رہنمائی کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ رسائل میں مختلف موضوعات پر متعدد ماہرین کے مضامین شامل ہوتے ہیں جو کہ معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں بلکہ تحقیق و تنقید کے لیے بنیادی ماخذات کا درجہ رکھتے ہیں نیز انہی مجلوں کی بدولت نئے تحقیقی و تنقیدی رجحانات اور نظریات سے آشنائی ہوتی ہے۔ مجوزہ تحقیقی مقالے کا موضوع " اردو تحقیق اور ادبی مجلے: ادبیات اور الاقربا کا تنقیدی مطالعہ "ہے جس میں ادبی رسائل کے تحقیقی کام کو منظر عام پر لایا جائے گا اور جس کا دورانیہ 2015 سے لے کر ۲۰۲۰ء تک کے عرصے پر محیط ہو گا۔

۲۔ بیان کا مسئلہ(Statement of Problem)

مختلف ادبی مجلوں کے تحقیقی و تخلیقی خدمات پر کام ہو بھی چکا ہے اور ہو بھی رہا ہے لیکن اردو تحقیق کے فروغ میں سہ ماہی ادبیات اور الاقرباء جیسے معیاری مجلوں کی خدمات کو اب تک احاطہ تحقیق میں نہیں لایا گیا۔ لہذا ادبی تحقیق کے فروغ میں ان ادبی مجلوں کی خدمات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

۳۔ مقاصدِ تحقیق(Research Objectives)

ا ادبی تحقیق کے فروغ میں ادبی مجلوں کی اہمیت کا جائزہ لینا

۲ ادبی مجلوں کے اجراء، ارتقاء، تحقیقی اور تنقیدی کام کی نوعیت کا تجزیہ کرنا

۳ ادبی مجلوں میں شائع ہونے والے تحقیقی مقالوں کے موضوعات کا تجزیاتی مطالعہ کرنا

۴۔ تحقیقی سوالات(Research Questions)

ا. ادبی تحقیق کے فروغ میں ادبی مجلوں کی اہمیت کیا ہے؟
۲. ادبی مجلوں کے اجراء، ارتقاء، تحقیقی اور تنقیدی کام کی نوعیت کیا ہے؟
۳. ادبی مجلوں میں شائع ہونے والے تحقیقی مقالوں کے موضوعات کی نوعیت کیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار(Theoretical Framework)

کسی بھی چیز کے اہم پہلوؤں کی شناخت کے لیے ادب کو پڑھنا، جائزہ لینا اور ترتیب دینا ادبی تحقیق کہلاتا ہے یہ دیگر تحقیقی طریقوں سے مختلف اس لیے ہے کہ اس کے تحت جس چیز کا مطالعہ کیا جارہا ہوتا ہے اس سے یہ براہ راست منسلک نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ادب کی مختلف اقسام کی معلومات تک بلا واسطہ رسائی دیتا ہے۔ جس کے لیے عام طور پر تجزیہ مشتملات(Content Analysis)کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔

تجزیہ مشتملات کی اصطلاح تقریباً پچھتر (۷۵) سال پرانی ہے۔ ویبسٹر ڈکشنری میں اس کا اندراج ۱۹۶۱ میں ہو چکا ہے۔ اس طریقہ تحقیق کا عملی استعمال صحافت کے میدان میں دوسری جنگ عظیم کے دوران پروپیگنڈے کی تکنیک اور دشمن کے حوصلے کے مطالعے کے سلسلے میں ہوا تاہم اس تحقیقی طریقے کی باقاعدہ اشاعت ۱۹۵۲ء میں برنارڈ برلسن(Bernard Barelson) کے ہاتھوں ان کی کتاب"Content Analysis in Communication Research" میں ہوئی جبکہ اردو میں اس طریقہ تحقیق کی مثالوں کے ساتھ وضاحت ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے اپنی کتاب "تحقیق کے طریقے" میں کی ہے۔

مجوزہ مقالے کے لیے بھی تجزیہ مشتملات(Content Analysis)کا طریقہ اپنایا جائے گا۔ اس طریقہ تحقیق کے مطابق مجوزہ موضوع کو درج ذیل تین پہلوؤں کے تحت دیکھا جائے گا۔

ا۔ افکار کے لحاظ سے

۲۔ طریقہ کار کے لحاظ سے

۳۔ اصناف کے لحاظ سے

۶۔ تحقیقی طریقہ کار(Research Methodology)

مقالے کا موضوع "اردو تحقیق اور ادبی مجلے:ادبیات اور الاقربا کا تنقیدی مطالعہ" ہے۔اس تنقیدی مطالعے کے لیے Content Analysis کا طریقہ اپنایا جائے گا۔ان مجلوں میں شائع ہونے والے افسانوی ،غیر افسانوی،شعری، لسانی اور ادبی نظریات سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مطالعہ Content Analysis کے تحت کیا جائے گا۔

اس تحقیقی مقالے میں ادبی تحقیق اور تاریخی طریقہ تحقیق کو مد نظر رکھا جائے گا۔ موضوع سے متعلق مطبوعہ مواد کی جمع آوری اور ان کا مطالعہ و تجزیہ کرنا ہو گا۔یوں بنیادی ماخذات میں ادبی رسائل شامل ہوں گے جبکہ ثانوی ماخذات میں صحافت اس کی تاریخ اور ادبی رسائل سے متعلق کتب،مضامین اور تبصروں سے استفادہ کیا جائے گا۔جن تک رسائی لائبریریوں اور انٹرنیٹ کے ذریعے کی جائے گی۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق (Works Already Done)

" اردو تحقیق اور ادبی مجلے:ادبیات اور الاقرباء کا تنقیدی مطالعہ ۲۰۱۵ء-۲۰۲۰ء" کے موضوع پر جامعاتی سطح پر کوئی کام نہیں ہوا۔تاہم ڈاکٹر انور سدید نے ادبی رسائل کے موضوع پر کتاب "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ابتدا تا۱۹۸۸ء" لکھی ہے۔اس کے علاوہ کوئی اور تحقیقی کام تاحال نظر سے نہیں گزرا۔

۸۔ تحدید(Delimitation)

مجوزہ مقالہ اردو تحقیق اور ادبی مجلے:ادبیات اور الاقرباء کے تنقیدی مطالعہ پر مشتمل ہے جس کا احاطہ ۲۰۱۵ءسے لے کر ۲۰۲۰ءتک ہے جبکہ رسائل کے انتخاب کے سلسلے میں ان ادبی رسائل کا انتخاب کیا گیا ہے جو کہ نہ صرف معیاری اور معروف ہوں بلکہ جن تک رسائی بھی با آسانی ہو۔یوں اسلام آباد میں شائع ہونے والے دو اہم ادبی مجلوں کو شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ان میں سے ایک مجلہ "ادبیات" اکادمی ادبیات سے شائع ہوتا ہے۔جو کہ اردو زبان و بیان کی ترقی و ترویج کے فروغ کا حکومتی ادارہ ہے۔جبکہ دوسرا مجلہ "الاقرباء" الاقرباءفاؤنڈیشن کی جانب سے نجی بنیادوں پر شائع ہونے والا مجلہ ہے۔جس کے نظم و نثر کا کچھ حصہ ہر سمسٹر میں ہارورڈ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا جاتا ہے۔

۹۔ تحقیق کی اہمیت(Significance of Research)

رسائل کی تاریخ تقریباً ۲۰۰ سال سے زائد کے عرصے پر مشتمل ہے۔اس عرصے میں مختلف ادبی رسائل وجرائد نے ادبی خدمات کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں جن ادبی رسائل نے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات انجام دیں ان میں سہ ماہی مجلے "ادبیات" اور "الاقرباء" شامل ہیں۔ اردو تحقیق کے فروغ میں ان مجلوں کا کردار کافی اہم ہے۔لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ادبی تحقیق کی ترقی اور ترویج میں ان مجلوں کی خدمات کو منظر عام پر لایا جائے۔یہ مقالہ اردو تحقیق کے فروغ میں ان مجلوں کی خدمات جاننے میں مددگار ہوگا۔

صحافت:

تجسس کا مادہ انسانی فطرت کا حصہ ہے۔اسی تجسس نے انسان کو ابتدا ہی سے اپنے گردو پیش کے متعلق جاننے پر مجبور کیا۔یوں خبر دار رہنا ازل سے انسانی فطرت میں شامل ہے لیکن پھر خبر کے حصول کے بعد دوسروں تک اپنی معلومات کی ترسیل کی خواہش بھی انسان کو مضطرب کیے رکھتی ہے۔اس خواہش کی تکمیل کے لیے انسان نے وقتاً فوقتاً طرح طرح کے ذرائع اختیار کیے مثلاً کبھی یہ خبریں طیور کی مدد سے تو کبھی ہرکاروں کی وساطت سے منزل مقصود تک پہنچیں۔لیکن پھر ریاست کے قیام کے ساتھ جب سیاسی نظام قائم ہوا تو خبر رسانی مخبری بن گئی اور اس مقصد کے لیے خفیہ محکمے قائم ہوئے۔ آلات طباعت کی ایجاد کے ساتھ خبر رسانی ایک باقاعدہ فن بن گئی۔بعد ازاں تیزی سے بدلتے حالات و واقعات سے اگاہی کی خواہش نے صحافت کا روپ دھار لیا۔

صحافت عربی زبان کے لفظ "صحف" سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی صفحہ،کتاب،رسالے یا صحیفے کے ہیں۔ صحف یا صحائف کی اصطلاح زمانہ قدیم میں مقدس کتابوں کے لیے استعمال ہوتی تھی حتی کہ قرآن مجید میں بھی حضرت ابراہیم اور موسیٰ پر نازل ہونے والی کتابوں کے لیے "صحف ابراہیم و موسیٰ" کے کلمات کا استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں "صحف" کا لفظ تقریباً آٹھ مقامات پر آیا ہے۔

انگریزی میں صحافت کا متبادل لفظ جرنلزم(Journalism) ہے جو کہ جرنل(Journal) سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی روزانہ حساب کا بہی کھاتہ یا روزنامچہ کے ہیں۔ فرہنگ عامرہ کے مطابق صحافت

سے مراد "اخباری کاروبار، رسالہ نگاری، اخبار نویسی ہے "(۱)۔ جبکہ علمی اردو لغت (جامع) کے مطابق صحافت سے مراد "نامہ نگاری، اخبار نویسی، انگریزی لفظJournal کا ترجمہ ۔(۲)

ڈکشنری آف جرنلزم میں صحافت کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

The business or practice of writing news media.2.The Study(and eventually practice) of writing for communication media.(۳)

جبکہ آکسفورڈ ڈکشنری میں جرنلزم کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

> "A set of practices through which information is found out and communicated often involving making public what would otherwise be private and which is typically published or broadcast in a format such as newspaper, magazine, bulletin, documentary, website or blog. journalism entails discovering or uncovering fresh, topical factual material and making it publicly available but it goes beyond that to include amplifying contextualization, or commenting on facts and that have already been made public. Journalism can range from hard news, current affairs and war reporting to soft news, colour pieces and features; it can be generalist or specialist, local or international, serious or popular. It can cover everything from investigative journalism in the public interest to writing a description of a sporting encounter, from reviewing a play to gallery reporting of politics. Notwithstanding the breath of the field at the heart of most journalism is reporting which relies on a mixture of observation, inquiry, verification and attribution in an attempt to produce as accurate a version of events as possible; at the same time, events are told as stories as a way of making them entertaining as well as informative. Implicit within journalism for many as a commitment to objectivity, although others dismiss the concept as impossibility, or even as nothing undesirable.(۴)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے مطابق:

> "صحافت کا لفظ صحیفہ سے نکلا ہے۔ صحیفہ کے لغوی معنی ہیں کتاب یا رسالہ۔ بہر حال عملاً ایک عرصہ دراز سے صحیفہ سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع

ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام اخبار ور سائل صحیفے ہیں اور جو لوگ ان کی ترتیب و تحسین اور تحریر سے وابستہ ہیں انہیں صحافی کہا جاتا ہے"(۵)

ادبی صحافت:

صحافت کا بنیادی کام خبر کی بلا تاخیر ترسیل ہے جو کہ جذبات سے عاری ایک پیشہ ورانہ عمل ہے جس کے لیے خام مواد خارج سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جس میں آج اور اب کو اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کی اہمیت کم ہونے کے ساتھ ساتھ بالآخر یہ لوگوں کی توجہ سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو یہ بھی جہاں اپنا خام مال خارج سے حاصل کرتا ہے لیکن اس کی تخلیق میں جذبات و احساسات کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے یوں اس کا اثر وقتی نہیں ہوتا بلکہ ہر دور کے قاری کے لیے لطف و انبساط کا باعث ہوتا ہے۔" ادبی صحافت میں بنیادی اہمیت ادب، تخلیقی اصناف، ادب کے مسائل اور مباحث کو حاصل ہے"(۶) ادبی صحافت تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ ادبی نظریات کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مضمون "اکیسویں صدی کی صحافت" میں ڈاکٹر شیخ نگینوی ادبی صحافت کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

"ادبی صحافت کے دائرے میں صحافت کا وہ حصہ آتا ہے جس کا تعلق زبان و ادب سے ہو۔ گویا ایسے تمام رسائل ادبی صحافت کے دائرے میں آئیں گے، جن میں زبان و ادب کے مختلف شعبوں سے متعلق تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ ایسے رسائل میں زبان و ادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین، شاعری اور نثری ادب کے نمونے، کتابوں پر تبصرے، زبان و ادب کے مسائل پر فیچر، ادبی اور لسانی صورتِ حال پر ادیبوں اور صحافیوں کی رائے وغیرہ شامل ہوتی ہے"(۷)

جبکہ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق ادبی صحافت سے مراد:

"A blend of journalistic reporting with narrative forms of storytelling that are more commonly associated with fiction writing. It may range from a brief colour piece to extensive long-form journalism, including that published in book form such as In Cold Blood by truman capote(1924-84).Literary journalism maybe produced by journalists adopting a more 'writerly' style than that allowed by the classic inverted pyramid model of news by novelists and other creators of fiction trying their hand at nonfiction and

by people who manage to slip back and forth between both genres"(۸)

مختصراً صحافت میں موجودہ عہد میں پیش آنے والے واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے اور صحافی انہی واقعات کی ترجمانی کرتا ہے اور وقت کے ساتھ چلتا ہے جبکہ ادبی صحافت میں واقعات کی تشریح کے ساتھ ساتھ اسلوب جذبات و تصورات پر بھی زور دیا جاتا ہے جس کے لیے زمان و مکان کی کوئی قید نہیں۔ ادب نہ صرف انسانی انبساط کا باعث ہوتا ہے بلکہ زندگی کو برتنے کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے۔ ہر دور میں ادب سے مختلف انداز میں کام لیا گیا ہے مثلاً روسو کی تحریریں جہاں فرانس میں انقلاب کا باعث بنی وہاں ہندوستان میں یہی کام الہلال اور البلاغ کی تحریروں سے لیا گیا۔ سرسید نے صحافت سے سماجی و تہذیبی اصلاح کا کام لیا۔ مختصراً ادب اور صحافت کا کام ایک ہی ہے لیکن لب و لہجے کی انفرادیت ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہے۔

ادبی مجلوں کی روایت کا پس منظری مطالعہ:

مجلہ، جریدہ، میگزین سے مراد وقفوں سے شائع ہونے والا رسالہ ہے۔ مجلہ یا رسالہ ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہانہ، دوماہی، سہ ماہی، شش ماہی یا سالانہ بھی ہو سکتا ہے۔ جو چیز اخبار کو رسالے سے ممیز کرتی ہے وہ اس کا مواد ہے اخبار کا مواد وقتی دلچسپی کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ واقعاتی انداز میں روزمرہ کے حالات و واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ مختصراً اس میں خبریت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے جبکہ رسالے کا مواد علمی، ادبی، ثقافتی و تاریخی عناصر پر مبنی ہونے کی وجہ سے مستقل نوعیت کا ہوتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں مجلاتی صحافت کا آغاز کلکتہ سے جاری ہونے والے سہ ماہی رسالے "Asian Miscellany of Bengal Register" سے ۱۷۸۵ء میں ہوا۔ جو کہ اپنے دور کا ایک معیاری اور مہنگا رسالہ شمار کیا جاتا تھا۔ اسی طرح کلکتہ سے ہی جاری ہونے والے دیگر رسائل جیسے "کلکتہ میگزین اور اورینٹل میوزیم" اور "کلکتہ منتھلی" بھی اپنے دور کے اہم رسائل مانے جاتے تھے۔ "ڈگ درشن"، "سماچار درپن" اور "فرینڈ آف انڈیا" جیسے رسائل اگرچہ تبلیغی ضرورتوں کے تحت ہی جاری کیے گئے تھے لیکن ان مجلوں میں علمی مضامین کے ساتھ ساتھ ادبی لحاظ سے بھی کچھ نہ کچھ چھپتا ضرور تھا۔

ہندوستان میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز پہلے اردو اخبار "جام جہاں نما" سے ہوتا ہے۔ جس کے ابتدائی چھے شمارے تو اردو میں شائع ہوئے لیکن بعد میں یہ اخبار ۱۶ مئی ۱۸۸۲ء کو فارسی میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے آغاز کے متعلق امداد صابری "تاریخ اردو صحافت" میں کچھ یوں لکھتے ہیں۔

۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو یہ اخبار شائع ہوا جو اردو زبان میں تھا لیکن اس کی یہ مدت بہت مختصر سی تھی چنانچہ ۸ مئی ۱۸۲۲ کو کلکتہ جرنل میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جس ہندوستانی اخبار کے چھے شمارے چھپ چکے ہیں اس کی زبان میں عنقریب ایک اہم تبدیلی ہونے والی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۶ مئی ۱۸۲۲ء سے اس اخبار کی زبان فارسی ہو گئی تھی اور اسی وقت سے اس اخبار پر نمبر شمار و نمبر جلد ڈالا جانا شروع ہوا"[۹]

یوں ہندوستان میں جام جہاں نما کو اردو صحافت کا نقطہ آغاز قرار دیا جاتا ہے اگرچہ اس میں دوسرے اخبارات سے خبریں لے کر چھاپی جاتی تھی لیکن ادبی لحاظ سے اس کی خدمات شاعری کی اشاعت ہے۔ اردو صحافت کے حوالے سے ایک اہم نام "دہلی اردو اخبار" کا بھی ہے جو کہ مولوی باقر علی کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا جس کے ادارت کی ذمہ داری ۱۸۵۴ میں مولانا محمد حسین آزاد نے سنبھالی۔ دہلی اردو اخبار میں جہاں معاشرتی، سیاسی اور علمی اداروں کی خبریں شائع ہوتی تھی وہاں اس دور کے ہم عصر شعرا جیسے کہ غالب، ذوق، بہادر شاہ ظفر اور مومن وغیرہ کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ ادیبوں سے متعلق خبروں کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔

اردو کے مجلاتی صحافت کا آغاز ۱۸۳۷ء میں "خیر خواہ ہند" نامی ماہانہ رسالے سے ہوتا ہے۔ اس رسالے کو عیسائی مذہب کی تبلیغی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ "قرآن السعدین" نامی ہفتہ وار اردو رسالہ مسٹر اشپرنگر کی سرپرستی میں جاری ہوا جس میں سیاست اور سائنس کے ساتھ ساتھ ادبی موضوعات پر مبنی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ "خیر خواہ ہند" نامی ایک دوسرا رسالہ ۱۸۴۷ء میں ماسٹر رام چندر کی ادارت میں دہلی سے جاری ہوا جس کا نام بعد میں تبدیل کر کے "محب ہند" رکھا گیا۔ ادبی لحاظ سے "محب ہند" کی عطا یہ ہے کہ اس میں یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے کے علاوہ بہادر شاہ ظفر اور شاہ نصیر کی غزلیں بھی شائع ہوئیں۔ "محب ہند" کے بعد اسی طرز کے مجلے ہندوستان کے دیگر علاقوں سے بھی جاری ہوئے جیسے کہ لاہور سے "ہمائے بے بہا"، "معلم ہند" اور "خورشید پنجاب" سیالکوٹ سے "نور علیٰ نور" اور آگرہ سے "مفید خلائق" جاری ہوئے۔

ادبی جریدہ نگاری کے فروغ میں سب سے اہم کردار گلدستوں نے ادا کیا ہے۔ان گلدستوں کا مقصد ہی شعر وشاعری کی اشاعت وترویج تھا۔ادبی گلدستوں کی اشاعت کے آغاز کے سلسلے میں مولوی کریم الدین کا نام لیا جاتا ہے جنہوں نے سب سے پہلا گلدستہ "گل رعنا" جاری کیا۔دراصل مولوی کریم الدین اپنے مکان پر مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔اس مشاعرے میں پیش کیا جانے والا کلام ہی "گل رعنا" میں چھپا کرتا تھا۔اس گلدستے کو اردو کا پہلا رسالہ بھی سمجھا گیا جبکہ محمد عتیق صدیقی کی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں" کے مطابق

> "مولوی عبد الرزاق صاحب کا یہ خیال تو صحیح نہیں ہے کہ گل رعنا اردو کا پہلا رسالہ تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ گل رعنا اردو کا غالبا گلدستہ تھا جس کو مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۵ء میں نہیں تو آگے چل کر ضرور جاری کیا"(۱۰)

"گل رعنا" کے طرز پر دوسرے شہروں سے بھی گلدستے جاری ہوئے جیسے کہ آگرہ سے "گلدستہ معیار شعرا" بنارس سے "گلدستہ گلزار ہمیشہ بہار" سامنے آیا لیکن اصل معنوں میں گلدستوں کو فروغ ۱۸۵۷ء کے بعد ملا کیونکہ ان گلدستوں میں صرف شعراء کا کلام ہی نہیں چھپتا تھا بلکہ علمی وادبی مباحثوں کے علاوہ شعراء کے کلام پر تنقیدیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ان گلدستوں کی بدولت ہم اس دور کی ادبی روایتوں سے آشنا ہو جاتے ہیں۔

ادبی صحافت کے فروغ میں اہم کردار "اودھ اخبار" نے بھی ادا کیا ہے۔لکھنؤ سے شائع ہونے والے اس اخبار میں ملک کے نامور شعراء، ادبا اور انشاء پرداز لکھا کرتے تھے۔اسلوب میں طنز ومزاح کا عنصر اس کی مقبولیت کا باعث بنا۔جس کی بنا پر "اودھ اخبار" کے طرز پر پنچ رسائل کا اجرا شروع ہوا جن میں سب سے زیادہ مقبولیت "اودھ پنچ" کو نصیب ہوئی۔۱۸۷۷ء کو جاری ہونے والے اس رسالے میں لطیفے، مزاحیہ نظمیں، پھبتیاں اور تمسخر اور تضحیک پر مبنی مضامین شائع ہوتے تھے۔طنزیہ ومزاحیہ اسلوب نے جہاں اسے مقبول عام بنایا وہیں سنجیدہ مسائل جیسے الحاق اودھ، انکم ٹیکس اور البرٹ بل پر آزادانہ تبصرے بھی شامل کیے جاتے تھے۔اس رسالے کے صفحات لکھنؤ کے رنگین طرز معاشرت جیسے محرم، چہلم، شب برات، ہولی، دیوالی، شاعری، پتنگ بازی اور بٹیر بازی کے معرکوں پر مبنی مضامین سے بھرے ہوتے تھے۔"اودھ پنچ" کے دیکھا دیکھی متعدد مزاحیہ رسائل جیسے کہ "سرپنچ

ہند" لکھنؤ سے "پنجاب پنچ"،"شریر"، "تیس مار خان" لاہور سے اور "کلکتہ پنچ"، "دہلی پنچ" وغیرہ شائع ہونا شروع ہوئے۔

صحیح معنوں میں ادبی مجلوں کا آغاز سر سید احمد خان کے ہاتھوں ہوا جنھوں نے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، علمی اور اخلاقی تربیت کے لیے "تہذیب الاخلاق" نامی رسالہ جاری کیا۔ جس میں اس دور کے نامور ادباء لکھا کرتے تھے۔ اس رسالے کے مضامین کے بدولت جہاں اردو میں سادگی و سلاست کو فروغ ملا وہیں انشائیہ جیسی صنف سے بھی اردو روشناس ہوئی۔ سر سید احمد خان کے ادبی جہت کو مزید جلا بخشنے میں اہم کردار میر ناصر علی کے "صلائے عام" عبدالحلیم شرر کے رسالہ "دلگداز" اور حسرت موہانی کے رسالے "اردوئے معلی" نے ادا کیا۔ درحقیقت انیسویں صدی کے انہی مجلوں نے نہ صرف فروغ ادب میں اہم کردار ادا کیا بلکہ قوم کی فکری، تہذیبی اور ادبی رہنمائی میں مؤثر کردار ادا کیا۔

بیسویں صدی میں تقسیم سے قبل جن ادبی جریدوں کی بہت دھوم تھی ان میں شیخ عبد القادر کا "مخزن"، مولانا ظفر علی خان کا "ستارہ صبح" دیانرائن نگم کا "زمانہ" ابوالکلام آزاد کا "الہلال" مولانا صلاح الدین احمد کا "ادبی دنیا" شاہد احمد دہلوی کا" ساقی" تاجور نجیب آبادی کا "شاہکار" میاں بشیر احمد کا "ہمایوں" مولانا حامد علی خان "نگار" اور چودھری برکت علی کا "ادب لطیف" وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ رسائل ایسے بھی ہیں جو کہ قیام پاکستان کے بعد بھی ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ معاشرے کی عملی ترقی میں اپنا کرداد ادا کرتے رہے ہیں۔

تقسیم کے بعد کے رسائل پر اگر نظر ڈالیں تو ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۹۹ء تک سامنے آنے والے رسائل کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ان میں سے کچھ رسائل ایسے ہیں جنھوں نے ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا بلکہ ایک نام اور ایک مقام بنایا اور ان میں سے کچھ تو آج بھی جاری ہیں ان رسائل میں چٹان، نقوش، قومی زبان، سنگ میل، اردو ادب، ماہ نو، اسلوب، فنون، سیپ، اوراق، تخلیق، پاکستانی ادب، معاصر، حروف، آج، مکالمہ، چہار سو، اردو نامہ، الحمرا، الاقربا، ارتقا، سحر، فانوس، چراغ راہ، سویرا وغیرہ شامل ہیں۔ اکیسویں صدی میں پاکستان کے نامور رسائل میں کراچی کا "دنیازاد"، "روشنائی"، "جوش شناسی"، "زرنگار"، "اجرا"، "اسالیب"، "کولاژ"، "اجمال" "رنگ ادب" لاہور کا "نمود"، "حرف لوح" گجرات کا "تناظر" فیصل آباد کا "نقاط" ملتان کا" پھیلوں" پشاور کا "احساس" اور کوئٹہ کا "سنگت" اور" قلم قبیلہ" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ علمی و ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں مختلف

درس گاہوں کے جاری کردہ مجلوں مثلاً گورنمنٹ کالج لاہور کا "راوی" اور ئینٹل کالج کا "بازیافت" نمل یونیورسٹی کا "دریافت" بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کا "معیار" قائد اعظم یونیورسٹی کا "مخزن" بہاؤالدین یونیورسٹی کا "یونیورسٹی میگزین" جامعہ سندھ حیدر آباد کا "صریر خامہ" جامعہ پشاور کا "یونیورسٹی جرنل" و دیگر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

سہ ماہی مجلہ ادبیات:

"سہ ماہی ادبیات" اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی طرف سے جاری ہونے والا ایک معروف تخلیقی و تحقیقی ادبی جریدہ ہے۔ پاکستانی زبانوں کے فروغ کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کے قائم کردہ اس ادارے کا پہلا شمارہ جب ۱۹۸۷ء کو منظر عام پر آیا تو مجلے کے ابتدائی شمارے کے حرف اول میں اس کے مقاصد کا تعین یوں کیا گیا:

> "ادبیات کا پہلا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک ادبی اور تحقیقی صحیفے کا اجرا اکادمی ادبیات پاکستان کے اساسی منشور میں شامل تھا۔۔۔ کچھ تاخیر بے شک ہو گئی ہے مگر کسی نصب العین کی طرف پیش رفت کی توفیق جس مرحلے پر بھی مل جائے وہ بہر حال تسکین کا مؤجب ہوتی ہے۔ ہم یہ پیش کش کسی ادعا کے بغیر مگر انکسار و عاجزی کے اعتراف (اور اندیشوں) کے ساتھ پیش کر رہے ہیں یوں بھی افراد کی عمر کی طرح اداروں کی عمر بھی ان کے کردار و کارکردگی ہی سے بنتی ہے اور "ادبیات" نے تو ابھی پالنے سے پہلا قدم زمین پر رکھا ہے جو ایسی نرم اور ہموار بھی نہیں۔ ہم اس وقت صرف اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے اوراق میں ایسا ادب پیش کر سکیں جو سخی ہو، کنجوس نہ ہو ـــــــ جس سے زندگی کی معنویت میں اضافہ ہو"۔ [۱۱]

یوں ادبیات خالص ادبی مزاج کا حامل ادبی جریدہ ہے جو کہ ہر تین ماہ بعد شائع ہوتا ہے۔ اس میں غیر مطبوعہ تحریریں کے علاوہ پاکستان کے علاقائی زبانوں اور بین الاقوامی ادب کے اردو تراجم بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ "ادبیات" حمد، نعت، افسانہ، سفر نامہ، انشائیہ، خود نوشت، ملاقات، نظم، غزل، طنز و مزاح پر مبنی تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ سہ ماہی ادبیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے عام شمارے اور خاص شمارے۔

i. **عام شمارے:**

عام شمارے نظم و نثر کی تقریباً تمام اصناف کی ادبی تحریروں، تحقیقی و تنقیدی مضامین علاقائی اور بین الاقوامی زبانوں کے تراجم پر مشتمل ہوتے ہیں اور عام شمارے ہر تین ماہ بعد باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔

ii. **خاص شمارے**

ادبیات کے خاص شمارے یا تو موضوعاتی ہوتے ہیں یا پھر شخصی۔ موضوعاتی اور شخصی شماروں میں مخصوص موضوع اور مخصوص شخصیات سے متعلق تحریروں پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان خاص شماروں میں عالمی نمبر (چھ جلدیں)، سارک ادب نمبر، خواتین کا عالمی نمبر، پاکستانی خواتین اہل قلم نمبر، بچوں کا ادب نمبر، نثری نظم نمبر، امرتا پریتم نمبر، منیر نیازی نمبر، احمد ندیم قاسمی نمبر، فیض احمد فیض نمبر، احمد فراز نمبر، جوش ملیح آبادی نمبر، پرواسی ادب نمبر، پاکستانی زبانوں کے چار اہم شاعروں کے حوالے سے خصوصی شمارے سامنے آچکے ہیں۔ یوں مجلہ ادبیات اردو ادب کی اشاعت و فروغ میں خاصا اہم رہا ہے۔ کیونکہ اس نے جہاں ملک بھر کے نمائندہ اہل قلم کی تحریروں اور تخلیقات اور علاقائی ادب کے تراجم کی اشاعت سے اپنے ملک کے اہل قلم طبقے کو روشناس کرایا ہے وہیں بین الاقوامی ادب کے تراجم کی اشاعت کی بدولت بین الاقوامی اہل علم طبقے سے بھی آشنائی دی۔

ابھی تک سہ ماہی ادبیات پر مختلف حوالے سے تحقیقی کام کیا جارہا ہے جو ابھی تک زیر تکمیل ہے مثلاً نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز کے پی ایچ ڈی اسکالر محمد آصف ادبیات میں شائع ہونے والے پاکستانی زبانوں کے ادب کے تراجم کے حوالے سے کام کر رہے ہیں اور ان کا موضوع ہے "اردو تراجم کے فروغ میں سہ ماہی "ادبیات" کا کردار (پاکستانی زبانوں کے ادب کے تراجم کے حوالے سے)"۔ سہ ماہی ادبیات کے حوالے سے دوسرا مقالہ نمل کے ہی ایم فل کے اسکالر سید فضل حسین کے زیر تکمیل ہے ان کے مقالے کا موضوع ہے "معاصر اردو افسانے کے فکری رجحانات کا تجزیاتی مطالعہ (سہ ماہی ادبیات اسلام آباد (۲۰۱۱ تا تاحال) میں شائع شدہ افسانے کے حوالے سے)" جبکہ نمل یونیورسٹی کی دوسری ایم فل اسکالر سعدیہ افتخار کا موضوع اگرچہ "اکادمی ادبیات پاکستان کی خدمات" (اردو زبان کے حوالے سے) ۲۰۱۶ء میں پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے جس میں انہوں نے جہاں اکادمی کی ادبی خدمات کو تفصیل سے اجاگر کیا ہے وہاں سہ ماہی "ادبیات" کی خدمات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

ادبیات نے اپنا سفر خالد اقبال کی ادارت میں ۱۹۸۷ء میں شروع کیا تھا۔ ان کے بعد نگہت سلیم اور محمد عاصم بٹ نے ادارت کے فرائض انجام دیے جبکہ آج کل ادبیات اختر رضا سلیمی کی ادارت میں ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔

سہ ماہی مجلہ الاقربا:

تحقیقی و تخلیقی سہ ماہی مجلہ "الاقربا" کی اشاعت کا آغاز سید منصور عاقل کی ادارت میں ۲۰۰۱ء میں اسلام آباد سے ہوا۔ جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء کے آخری شمارے کے مطابق سید منصور عاقل نے بطور صدر نشین اور پروفیسر ہما سالاری نے ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ جبکہ مجلس مشاورت میں درون ملک سے پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، ڈاکٹر عالیہ امام، ڈاکٹر قرۃالعین طاہرہ، سید محمد سلیمان شامل ہیں جبکہ بیرون ملک سے پروفیسر ڈاکٹر علی آسانی "صدر شعبہ انڈو مسلم اینڈ اسلامک کلچر ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ، پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق ار صدر نشین شعبہ اردو زبان و ادب استنبول یونیورسٹی ترکی، پروفیسر ڈاکٹر سویمانے یاسر صدر شعبہ اردو اوساکا یونیورسٹی جاپان اور پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انڈیا جیسے معتبر شخصیات اس مجلے کے مجلس ادارت میں شامل ہیں۔ سہ ماہی مجلے "الاقرباء" کے در پردہ ادب کے وسیلے سے معاشرتی زندگی کو پر امن بنانے کی خواہش تھی چنانچہ ابتدائی ادارتی کلمات "تمنا کا پہلا قدم" میں اس کے مقاصد کا تعین یوں کیا گیا۔

> "غالب کے لیے تو دشت امکاں کی تمام وسعتیں سمٹ کر نقش پا بن گئی تھی لیکن ہم نے جس دشت خار میں تمنا کا پہلا قدم رکھا ہے وہاں پہلے ہی بہت سے سودا صرف برہنا پا ہی نہیں بلکہ پا شکستہ ولہولہان نظر آرہے ہیں۔ بعض اقدار میں تبدیلی اور بعض میں پامالی کا عمل اس تیزی سے پھیلا ہے کہ زندگی کے نئے نظام ترجیحات میں اپنے سیاق و سباق سے برگشتہ نظر آتی ہے مادیت کی سفاکانہ یلغار نے ادب و فنوں کے ارفع تصورات کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا ہے اور خود انسانی ذہن نے نسل انسانی کی ہلاکت کے لیے سائنس وترویج کے نام پر وہ اسباب پیدا کر دیے ہیں کہ صرف ایک اشتعال پرور لمحہ تمام گردوپیش کو خاک کے ڈھیر میں تبدیل کر سکتا ہے پاکستان ہی میں نہیں بلکہ لگتا ہے کہ دنیا بھر میں اخلاقی قدریں اور احترام انسانیت کے نظریات ٹھیٹ مادہ پرستی کے ہاتھوں یرغمال ہو کر رہ گئے ہیں تاہم اس ظلمت آلود فضا میں کہیں کہیں روشنی کی رمق دکھائی

دیتی ہے جو نتیجہ ہے ان ارباب اخلاص کی بے لوث کاوشوں کا جو مادی و سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی کو اعتدال و توازن سے ہمکنار کرنے کے لیے فنون لطیفہ کی بقا اور اخلاقیات سے مرصع شعر وادب کے ذریعہ نجات ہونے پر یقین رکھتے ہیں"[۱۲]

اس مجلے کے ادبی مزاج کی اگر بات کریں تو یہ مجلہ عام طور پر مختلف حصوں مثلاً مضامین و مقالات، اقبالیات، تاریخ، عالمی ادب، یاد رفتگاں، خصوصی گوشہ، انشائیہ افسانہ کہانی، متفرقات، حمد ونعت سلام، غزل، نظم، نقد و نظر، مراسلات اور خبر نامہ الاقربافاؤنڈیشن پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مجلے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں نہ صرف پاکستانی ادیبوں کی بلکہ امریکہ، ہندوستان، کینیڈا، چین، انگلینڈ، فرانس، سعودی عرب، قطر، عمان، ترکی وغیرہ کے ادیبوں کی غیر مطبوعہ تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ اس مجلے نے نہ صرف پاکستان میں بلکہ عالمی سطح پر بھی نام اور مقام بنایا۔ پاکستان میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان نے جامعات میں تحقیقی مقالات میں بطور حوالہ جات کے "الاقرباء" سے استفادہ پر زور دیا ہے جبکہ عالمی سطح پر ہارورڈ یونیورسٹی کے طلبا کے لیے اس کی نظم و نثر کا کچھ حصہ نصاب میں شامل کیا جاتا ہے نیز مجلے کے ادبی معیار کی بدولت جہاں عالمی ادارے ISSN نے رجسٹر کیا وہیں علمی مجلوں کی ڈائرکٹری (ULRICH) کے ڈیٹا بیس میں بھی اسے شامل کیا گیا ہے۔

ج۔ مشتملاتی تجزیہ:

تجزیہ مشتملات مواد کے تجزیے کے منظم مطالعے کا نام ہے جس میں متن، تصاویر اور علامتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مواد کا یہ تجزیاتی مطالعہ نہ تو صارف کے نقطہ نظر سے ہوتا ہے اور نہ ہی مصنف کے نقطہ نظر سے ہوتا ہے۔ ان سوالات کا جواب تلاشا جاتا ہے جو کہ نہ صرف دستیاب متن میں ہوتے ہیں بلکہ متن سے باہر ہوتے ہیں۔

تجزیہ مشتملات کی اصطلاح کا باقاعدہ اندراج ۱۹۶۱ء میں ویبسٹر ڈکشنری میں ہوا۔ مریم ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق تجزیہ مشتملات سے مراد ہے:

> Analysis of the manifest and latent content of a body of communicated material (such as a book or film)through a classification, tabulation, and evaluation of its key symbols and themes in order to ascertain its meaning and probable effect."[۱۳]

جبکہ کولائینز ڈکشنری کے مطابق تجزیہ مشتملات سے مراد:

analysis to determine the meaning, purpose, or effect of any type of communication، as literature, newspapers, or broadcasts, by studying and evaluating the details, innuendoes, and implications of the content, recurrent themes etc. " (۱۴)

برنارڈ بیر لسن جس نے اس تحقیقی طریقے کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے کے مطابق تجزیہ مشتملات کسی بھی طرح سامنے آنے والے مواد کے حقیقت پسندانہ، منظم و مرتب مقداری تجزیے کا نام ہے وہ اس طریقہ تحقیق کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

"research technique for the objective, systematic and quantitative description of the manifest content of communication" (۱۵)

تجزیہ مشتملات کے حوالے سے ایک معتبر نام کرپنڈورف کا بھی ہے وہ اس تحقیقی طریقے کی وضاحت ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"Content analysis is a research technique for making replicable and valid inferences from texts (or other meaningful matter) to the contexts of their use-" (۱۶)

جبکہ ہولسٹی کے مطابق:

"Content analysis is any technique for making inferences by objectively and systematically identifying specified characteristics of messages" (۱۷)

اردو میں اس تحقیقی طریقے کی وضاحت ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے اپنی کتاب "تحقیق کے طریقے" میں کی ہے ان کے مطابق:

> "تجزیہ مشتملات (Content Analysis) تحقیق کا ایک ایسا طریقہ ہے جو بڑی حد تک چھپے ہوئے مواد کے تجزیے کے لیے مخصوص ہے۔ پڑھنے یا سننے کے جس مواد کا ابلاغ ایک فرد سے دوسرے فرد کو ہوتا ہے اسے بنیادی اور غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مواد مرسل (S) سے وصول کنندہ (R) تک پہنچتا ہے اور اسی کی بنیاد پر اس کے ذہن میں اچھے، برے، پسند و ناپسند اور کسی خیال کو قبول یا مسترد کرنے کے تصورات قائم ہوتے ہیں۔ پیغام (M) کی یہ غیر معمولی اہمیت ہی ہے جس کی وجہ سے اسے ابلاغ عامہ سے متعلق تحقیق میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں پیغام کو مرتب کرنے والا (S) یا مرتب کرنے والوں کا کوئی ادارہ (مثلاً کسی اخبار کا دفتر، ٹیلی

ویژن یا ریڈیو اسٹیشن) پیغام کو زیادہ سے زیادہ کامیاب اور مؤثر بنانے کی کوشش کر سکتا ہے۔شاید یوں کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ ابلاغ عامہ کے لیے کوئی پیغام(M)مرتب کرنے والوں(S) کو اگر زیادہ کامیابی حاصل کرنے کی جستجو ہو گی تو وہ پیغام کے مشتملات پر غور کریں گے اور تحقیق کی روشنی میں اسے بہتر بنانے کی سعی کریں گے۔مشتملات پر غور وخوض اور اس کے اثرات کا یقین حاصل کرنے کے لیے ابلاغ عامہ کے میدان میں تحقیق کرنے والوں نے تجزیہ مشتملات کے طریقے پر توجہ مرکوز کی ہے لیکن یہ سمجھنا درست نہ ہو گا کہ تجزیہ مشتملات صرف ابلاغ عامہ کی میدان میں تحقیق کا ایک طریقہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اسے کسی بھی طرح کے مواد کو سمجھنے کی کوشش میں استعمال کیا جاسکتا ہے"(۱۸)

تجزیہ مشتملات(Content Analysis)صرف ابلاغ عامہ کی جانچ تک ہی محدود نہیں بلکہ اسے کسی بھی طرح کے مواد کے تجزیے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔اس طریقہ تحقیق کے ذریعے سے کسی بھی قسم کے مواد کی اہمیت ،افادیت، ابلاغ کرنے والوں کے ذہن اور ان کے پالیسیوں کو باآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔یوں تجزیہ مشتملات بعض اوقات بیش قیمت خدمات انجام دے سکتا ہے۔

تجزیہ مشتملات کی تاریخ:

مشتملاتی تجزیے کی تاریخ کی اگر بات کریں تو اس کے ابتدائی اثرات اٹھارویں صدی عیسوی میں سویڈن میں ملتے ہیں کہ جب "زیون" نامی حمدیہ نظموں کی اشاعت سامنے آئی جس پر چرچ کو کمزور کرنے کا الزام لگایا گیا۔اس الزام کے نتیجے میں حمدیہ نظموں کے تجزیے کا فیصلہ ہوا۔اس تجزیاتی مطالعے میں اس دور کے نامور علما نے حصہ لیا۔کچھ نے نظموں میں مذہبی علامتوں کی فہرست بنالی جبکہ کچھ کے بقول ان نظموں میں استعمال ہونے والی علامتیں سرکاری چرچ میں پڑھائے جانے والے سیاق وسباق سے ہٹ کر ہیں۔ جس نے اس بحث کو جنم دیا کہ آیا لفظی تشریح پر توجہ دی جائے کہ استعاراتی پر۔اس تنازعے نے بہت سے سوالات اور مباحث کو جنم دیا جو آج تجزیاتی مطالعے کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔

باقاعدہ طور پر ابتدائی تجزیاتی مطالعہ جان گلمر سپیڈ(John Glimer Speed)نے ۱۸۹۳ء میں نیویارک کے چار روزناموں کا پہلا مقداری تجزیہ اس سوال کے تحت کیا کہ "کیا اب اخبارات خبریں دیتے ہیں" اس تجزیے میں مصنف نے یہ دکھایا کہ کس طرح ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۳ء کے دوران نیویارک

کے اخبارات نے مذہبی، سائنسی اور ادبی مضامین پر گپ شپ، کھیل اور اسکینڈل پر مبنی خبروں کو فوقیت دی۔

جب کہ ۱۹۱۰ء میں میتھیو نے اسی طرح کا مقداری تجزیہ انچز کے ذریعے کر کے دکھایا کہ کس طرح نیو یارک کے ایک روزنامہ اخبار نے اخبار کا ایک قابل قدر حصہ مایوس، غیر تسلی بخش اور معمولی خبروں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ مختصراً بیسویں صدی کے اخبارات میں مخصوص موضوعات پر مبنی کالم کو انچز کے حساب سے ماپ کر اخبارات کی اصلیت بتانے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں کچھ کا خیال تھا کہ ایک ایسا طریقہ معلوم کر لیا گیا ہے جس سے پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ زرد صحافت کے پیچھے پیسہ کمانا مقصود ہے جبکہ کچھ کے نزدیک اخبارات کی بدولت جرائم جیسی سرگرمیوں کو بڑھاوا ملا ہے۔

لیکن بیسوی صدی میں خاص طور پر ۱۹۳۰ء کے بعد نئے الیکٹرانک میڈیا کی آمد نے اخبارات کے تسلط کو چیلنج کیا کیونکہ اخبارات کی طرح ریڈیو اور ٹیلی وژن کے صارفین کے لیے پڑھا لکھا ہونے کی شرط ضروری نہ تھی۔ امریکا کو ۱۹۳۰ء کے بعد کئی سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور امریکیوں کے بقول جرائم کی بڑھتی شرح اور ثقافتی اقدار کی خرابی کے پیچھے زرد ثقافت اور میڈیا کا ہاتھ ہے یوں یہ ذرائع لوگوں کے رویوں میں تبدیلی لانے کا باعث بنے۔ اس دور میں سماجی ماہرین نے بڑے پیمانے پر سروے ریسرچ اور پولنگ کا استعمال کیا اور حاصل شدہ نتائج نے سنجیدگی سے مواد کے تجزیاتی مطالعے کی دعوت دی۔ اس دور میں مواصلات کا تجزیہ اس قسم کے سولات کے تحت کیا گیا کہ فلاڈیلفیا پریس میں نگرو کو کیسے پیش کیا گیا؟ امریکہ نے دشمن ممالک کی ممالک کے مقابلے میں ان جنگوں کو نصابی کتب میں کیسے بیان کیا جس میں اس نے حصہ لیا تھا؟ امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں بچوں کی کتابوں میں قوم پرستی کا اظہار کیسے کیا گیا؟

> Questions of representations were raised, with researchers examining Topics such as how Negroes were presented in the Philadelphia press (Simpson,1934); how U.S. textbooks described wars in which the United States had taken part, compared with textbooks published in countries that were former U.S. enemies (Walworth, 1938); and how nationalism was expressed in children's books published in the United States, Great Britain, and other European countries (Martin, 1936)[۱۹]

اس عرصے میں پسند ناپسند، افواہیں اور تعصب جو کسی ادارے کے ذریعے سفر کرتے ہوئے چھپے ہوئے مواد کی صورت میں سامنے آیا۔ بڑی حد تک لوگوں کے رویوں میں تبدیلی کا باعث بنا جس کی بنا پر نفسیاتی لحاظ سے بھی اخبارات کا تجزیہ کیا گیا۔ نیز سیاسی علامتوں کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ بھی اسے دور کی دین ہے مثلاً میک ڈارمڈ (۱۹۳۷) نے تیس امریکی صدور کے افتتاحی تقاریر کا تجزیاتی مطالعہ قومی شناخت، تاریخی اہمیت، حکومت، حقیقت اور توقعات کی علامتوں کے ذریعے کیا۔

> McDiarmid (1937), for example, examined 30 U.S. presidential inaugural addresses for symbols of national identity, of historical significance, of government, and of fact and expectations (۲۰)

لیکن اس طریقہ کار کی پہلی جامع تصویر ۱۹۴۸ میں میمو گرافڈ ٹیکسٹ جس کا عنوان "The Analysis of Communication Content Authored by Berelson & Lazerfeld" میں سامنے آئی جو کہ بعد میں "Berelson's Content Analysis in Communication Research(1952)" کے نام سے سامنے آئی۔

تجزیہ مشتملات کو سب سے زیادہ چیلنج کا سامنا دوسری جنگ عظیم کے دوران کرنا پڑا۔ دراصل پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجی کاروائیوں کے لیے عوامی حمایت کے حصول کے لیے جذباتی بیداری اور دوسری صورت میں اپنے ہم وطنوں اور خواتین کو ان اقدامات کی قبولیت کی تیاری کے لیے پروپیگنڈے کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ دشمن کے جنگی عزائم اور لوگوں پر ان کے اثرات معلوم کرنے کے حوالے سے اس طریقہ کا استعمال امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک نے کیا۔ اس حوالے سے دو گروپ سامنے آئے۔ ایک لائیبریری آف کانگرس گروپ(Library of Congress Group) اور دوسرا ایف سی سی گروپ(FCC)۔ لائیبریری آف کانگرس گروپ نے مقداری تجزیے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس سلسلے میں نمونہ بندی، پیمائش کے مسائل اور زمروں کے تعین کے حوالے سے کام کیا جبکہ ایف سی سی گروپ نے نازی جرمنوں اور دیگر ممالک کے اندر ہونے والے حالات کو سمجھنے اور اتحادی فوجی کاروائیوں کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے دشمن کے گھریلو نشریات کا تجزیہ کیا۔ دراصل ایف سی سی گروپ نے یہ دریافت کیا کہ نازی جرمنوں اور دیگر ممالک کے گھریلو پریس کا فوجی کاروائیوں کے رائے عامہ کی ہمواری کے لیے کی جانے والی کوششوں سے دشمن کے مقاصد کے

بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں اور پھر اسی طریقہ کار کے مطابق وہ نازی اشرافیہ کے حالات کے بارے میں اندازہ لگانے، نازی گورننگ گروپ کے اندر سیاسی تبدیلیوں اور محور ممالک کے درمیان تعلقات میں ہونے والی تبدیلیوں اور بڑی عسکری و سیاسی مہمات کی پیش گوئی کرنے کے قابل ہوگئے یہاں تک کہ برطانیہ کے خلاف جرمن وی ہتھیاروں کی تعیناتی کی تاریخ کے حوالے سے برطانوی تجزیہ کاروں کی، کی جانے والی پیش گوئی چند ہفتوں بعد درست ثابت ہوئی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے جرمن پروپیگنڈسٹ جوزف گوئیبلز کی تقریروں پر نظر رکھی۔

لائبریری آف کانگرس گروپ اور ایف سی گروپ کی ان کاوشوں کو کلاز کرپنڈورف(Klaus Krippendoriff) اپنی کتاب(Content Analysis An Introduction to its Methodology)میں یوں ذکر کرتے ہیں۔

> Two centers devoted to propaganda analysis emerged---The Library of Congress group focused on analyzing newspapers and wire services from abroad and addressed basic issues of sampling, measurement problems, and the reliability and validity of content categories, continuing the tradition of early quantitative analysis of mass communications--- The FCC group analyzed primarily domestic enemy broadcasts and surrounding conditions to understand and predict events within Nazi Germany and the other Axis countries, and to estimate the effects of Allied military actions on the war mood of enemy populations. ---In order to ensure popular support for planned military actions, the Axis leaders had to inform; emotionally arouse, and otherwise prepare their countrymen and women to accept those actions; the FCC analysts discovered that they could learn a great deal about the enemy's intended actions by recognizing such preparatory efforts in the domestic press and broadcasts. They were able to predict several major military and political campaigns and to assess Nazi elites' perceptions of their situation, political changes within the Nazi governing group, and shifts in relations among Axis countries. Among the more outstanding predictions that British analysts were able to make was the date of deployment of German V weapons against Great Britain. The analysts monitored the speeches delivered by Nazi propagandist Joseph Goebbels and

inferred from the content of those speeches what had interfered with the weapons' production and when. They then used this information to predict the launch date of the weapons, and their prediction was accurate within a few weeks.[۲۱]

یوں دوسری جنگ عظیم کے دوران مخصوص معلومات کے حصول کے لئے تجزیہ مشتملات کے استعمال سے کچھ نئے نکات سامنے آئے جیسے کہ تجزیہ کاروں کو ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے چاہیے جو کہ متن سے باہر ہوتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وقتی ترتیب، افراد کی ضروریات اور توقعات، افراد کی ترجیحی گفتگو اور وہ سماجی حالات جس میں کوئی متن (پیغام) سامنے آتا ہے کو مد نظر رکھتے ہوئے مواصلات کا تجزیہ کرے۔ پروپیگنڈے کے تجزیہ کاروں کی کامیابی کی وجہ بھی یہی تھی کہ انہوں نے مواصلات کا تجزیہ انہی پہلوؤں کے تناظر میں کیا تھا۔

For analysts seeking specific political information, quantitative Indicator are extremely insensitive and shallow. Even where large amounts of quantitative data are available, as required for statistical analyses, this tend not to lead to the "most obvious" conclusions that political experts would draw from qualitative interpretations of textual data. Qualitative analyses can be systematic, reliable, and valid as well.[۲۲]

تجزیہ مشتملات کو کمیتی حوالے سے بھی پایہ تکمیل تک پہنچایا جاسکتا ہے اور کیفیتی لحاظ سے بھی۔ جب کے اس تحقیقی مقالے میں مواد کا تجزیاتی مطالعہ کیفتی لحاظ سے کیا جائے گا۔ کیفیتی طریقہ کار کے پھر مزید چھے اقسام ہیں۔ جن میں سے ایک مطالعہ احوال ہے۔ مطالعہ احوال کسی شخص، گروہ، ادارے، یا پھر کسی خاص صورت حال کے تفصیلی مطالعے کا نام ہے۔ کسی مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور اس کے تجزیے کے لیے یہی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسئلے کے اس تفہیم، تشریح و توضیح میں کمیتی اور کیفتی دونوں طریقہ کار سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس مقالے میں بھی مطالعہ احوال کے طریقے سے استفادہ کیا گیا ہے ۔

حوالہ جات

۱. محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۳۸۹

۲. علمی اردو لغت جامع، وارث سرہندی ایم اے، علمی کتب خانہ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور طبع دوم ۱۹۷۷، ص ۹۷۴۔

۳. MONEEKA SAREEN,Dictionary of Journalism,IVY publishing House Delhi-110095,ist edition2007,pg174

۴. TONY HARCUP,Oxford Dictionary of journalism,Oxford university press,ist Ed2014,pg148

۵. ڈاکٹر، عبدالسلام خورشید، فن صحافت، کاروان پریس لاہور، ۲۰۰۸ء

۶. ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۴-۱۵

۷. https://adbimiras.com/ikkiswi-sadi-ki-adabi-sahafat-sheikh-naginvi/ ،25،12،2021، 9:50PM,

۸. TONY HARCUP,Oxford Dictionary of journalism,pg 164

۹. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو جلد اول، ۱۹۵۳، دہلی، ص ۶۱، ۶۲,

۱۰. عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷، ص ۲۸۷۔

۱۱. (حرف اول) سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۱۹۸۷ء

۱۲. (اداریہ) سہ ماہی الاقربا، اسلام آباد، جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء۔

۱۳. https://www.merriam-webster.com/dictionary/content%20analysis T,10:34PM,14,11,2021

۱۴. https://www.collinsdictionary.com/dictionary/english/content-analysis,10:37 PM,14/11/2021

۱۵. JAMES W.DRISKO, TINA MASCHI, Content Analysis, Oxford University Press,2016,P3

۱۶. Klaus Krippendorf, Content Analysis An Introduction to Its Methodology (Second Edition) Sage Publications International and professional Publisher Thousand Oaks, London, New Delhi,2004,p18

۱۷. AlAN BRYMAN,social research methods(4^{th} Edition),Oxford University Press,2012,p289

۱۸. نثار احمد زبیری،ڈاکٹر، تحقیق کے طریقے،دارالاشاعت مصطفائی،۲۰۱۶ء،ص۱۰۸

۱۹. Klaus Krippendorf, Content Analysis An Introduction to Its Methodology (Second Edition)p3

۲۰. ایضاًص۷

۲۱. ایضاص۹

۲۲. ایضا،ص۱۰

باب دوم:

ادبی مجلوں میں نثری مقالات / آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ

(۲۰۱۵ء تا ۲۰۲۰ء)

(الف): ادبیات میں افسانوی نثر پر مبنی تحقیقی و تنقیدی تحریریں

ا۔ افسانے پر مبنی آرٹیکل

افکار کے لحاظ سے:

۲۰۱۵ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک کے ادبیات کے مجلے کے مضامین میں افسانے پر سیاست، معیشت، معاشرت / سماج، تہذیب، نفسیات، وجودیت، جدیدیت اور نو آبادیات کے حوالے سے کچھ یوں بحث کی گئی ہے۔

سیاست:

ان مضامین میں سیاسی حوالے سے احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور عبد اللہ حسین کے افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے مطابق قاسمی چونکہ گزشتہ پچاس برسوں کے دوران سماجی اور تہذیبی انتشار کا شکار پاکستان کے دیہی اور شہری معاشرے کو موضوع بناتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں زمانہ حال کی اقتصادی اور سیاسی استحصال کے رخ نمایاں ہوئے۔ ڈاکٹر تحسین بی بی، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا جائزہ سیاسی تناظر میں لیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "احمد ندیم قاسمی معاشی بدحالی اور سماجی برائیوں کو اشتراکیت کے دوہرے جذبوں اور فلسفوں کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ معاشی سے زیادہ سیاسی مسئلے بن جاتے ہیں"(۱) یوں احمد ندیم قاسمی کے یہاں سیاسی حوالے سے تحریک خلافت، تحریک پاکستان، تقسیم، ہجرت کے اثرات، قیام پاکستان کے بعد کے حالات، ۱۹۶۵ء کی جنگ، سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں دوسری ہجرت اور انگریزوں کی جابرانہ سیاسی و معاشی پالیسیاں، گاؤں کی سیاست، چوہدریوں کی سفاکیاں، بالائی طبقے کی استحصالی ذہنیت، معاشی تنگ دستی اور نچلے طبقے کی محرومیوں کا بیان ملتا ہے۔ یہ سارے حوالے ان کے افسانے "سرخ

ٹوپی"، "ارتقا"، "پرمیشر سنگھ"، نیا فرہاد"، "میں انسان ہوں"، "کفن دفن"، "کپاس کا پھول"، "اندمال"، "تسکین"، "کہانی لکھی جارہی ہے"، "جب بادل اڈے "طلائی مہر" ، "کفارہ"، "چوری"، "قلی"، "بھوت"، "اسلام علیکم"، "ننھے نے سلیٹ خریدی"، "سرخ ٹوپی، "ارتقا"، "کنگلے"، "ووٹ"، "جلسے"، "کرسی نشین"، "سونے کا ہار"، "پکا مکان"، "غریب کا تحفہ"، "مہنگائی الاؤنس"، "آزاد منش" اور "شعلہ نیم خوردہ" شامل ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی ہولناک تصاویر اپنے افسانوں "سپاہی بیٹا"، "مامتا"، "ہیرا"، "آتش گل"، "بابا نورا"، "ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد" میں پیش کیں۔

ڈاکٹر عباس رضا نئیر، انتظار حسین کے افسانے "کشتی" کا تجزیہ سیاسی تناظر میں کرتے ہیں۔ کشتی جس کا موضوع ہجرت ہے کہانی میں اس ہجرت کو ماضی کے دیگر ہجرتوں سے بھی جوڑا گیا ہے۔ کشتی میں سوار جانداروں اور ان کے افعال کی تعبیر سیاسی تناظر میں یوں کی گئی ہے کہ بلی جسے نوحؑ نے شیر کے منہ سے دہشت گرد چوہوں کے خاتمہ کے لیے بچایا تھا وہی بلی دہشت گرد بن کر فاختہ کے منہ میں زیتون کی پتی دیکھ کر جھپٹ پڑتی ہے۔ بلی کے اس عمل کو عالمی سیاست سے جیسے امریکا کا روس کے مقابلے میں افغانی طالبان کو کھڑا کرنے کی کوششوں سے جوڑا گیا ہے اور آج اسی امریکہ پر طالبان کے جوابی غراہٹوں کا بیان استعاروں اور علامتوں کے ذریعے کہانی میں ملتا ہے۔

عبد اللہ حسین کے سیاسی فکر کا اظہار چار مضامین میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں ہجرت کا حوالہ متواتر ملتا ہے جس کے درپردہ وجوہات فکری، معاشی و تہذیبی اور سیاسی ہی ہیں۔ ان کے افسانے "جلا وطن" میں سیاست، معیشت اور تہذیب سے فرار کے لیے جلاوطنی اختیار کی گئی ہے جس کی بڑی وجہ سیاسی حالات ہیں۔ ان کے یہاں سیاسی شعور علامتی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ افسانہ "ندی" میں سیاسی حالات و واقعات کا بیان علامتی پیرائے میں ملتا ہے۔ افسانہ "دھوپ" تقسیم ہند کے نتیجے میں مہاجرت کے مسئلے اور کرب کو موضوع بناتا ہے۔ افسانہ "مہاجرین" میں کہانی باپ اور بیٹے کے مکالمے کی صورت میں آگے بڑھتی ہے جو کہ پنجاب کے لینڈ سکیپ کے ساتھ پہلی جنگ عظیم اور کہیں کہیں ہٹلر کے ذکر پر مبنی ہے۔ علامتی پیرائے پر مبنی افسانہ "سمندر" کے متعلق مضمون نگار یوں اظہار خیال کرتا ہے کہ "اس افسانے میں بھی جلا وطنی، سیاسی، تہذیبی شعور، مہاجرت کا مسئلہ، آزادی و پابندی اور جبر و اختیار کی عکاسی علامتی پیرائے میں نہایت خوبی سے کی گئی ہے۔"(۲) یہ افسانہ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ مشرقی و مغربی جرمنی کی تقسیم کے نتیجے میں سیاسی، معاشی اور سماجی ابتری کے بیان پر مبنی ہے۔

معیشت:

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا معاشی حوالے سے لیے گئے جائزے کے مطابق معیشت کے ظالمانہ جبر کے ذاتی تجربے نے قاسمی کے ترقی پسندیت سے انسلاک میں اہم کردار ادا کیا۔اس لیے اس موضوع کے تحت کھل کر لکھا۔ جس سے جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی خامیاں نمایاں ہوئیں۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین قاسمی کے افسانے کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

" وہ انسان کی فطری سادگی اور معصومیت کے قائل نظر آتے ہیں اس لیے ان کے افسانوں کا تار و پود محبت سے تیار ہوتا ہے۔اس جنت کو تعمیر کرنے کے بعد وہ حقیقی، فطری اور امکانی انداز میں سماجی قوانین سرمایہ درانہ استحصال کی بھینٹ چڑھاتے دکھاتے ہیں۔ اس جگہ جس فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمیں افسانہ طلائی مہر، کریا کرم، کپاس کا پھول، پہاڑوں کی برف، ثواب اور رئیس خانہ میں نظر آتی ہے "(۳)

معاشی حوالے سے لیے گئے جائزوں میں معاشی جبر و استعداد کے شکار معصوم بچوں کا ذکر ملتا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کے بقول" فقر و فاقہ میں مبتلا ماؤں اور ناداری و محرومی کے کچوکے سہتے ہوئے بچوں کے مصائب کو ندیم نے بڑی دردمندی کے ساتھ سمجھا اور انقلابی انداز نظر کے ساتھ پیش کیا"(۴) ان کے افسانوں میں معاشی مسائل کے شکار جتنے بھی بچوں اور ماؤں کا ذکر ملتا ہے ان پر احمد ندیم قاسمی کے اپنے زندگی کا عکس چھایا ہوا ہے۔ سرداری اور جاگیر دارانہ نظام جہاں بچوں کے استحصال سے نہیں شرماتا وہیں نسوانی حسن کو تاراج کرنا اپنا حق سمجھتا ہے جو اس استحصال کے نتیجے میں یا تو جن، پریاں بن کر زندگی گزارتی ہیں یا پھر ان کی بغاوت اینٹ پتھر پھینکنے پر منتج ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ رنگی کی صورت میں لارنس کے گردن مروڑنے تک محدود ہوتی ہے۔ جاگیرداروں اور سرداروں کے ہاتھوں مظلومی نسواں کے یہ رویے "بین"، "لارنس آف تھیلیبیا"، "گڑیا"، "ماسی گل بانو" میں ملتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے کی عورتیں جب معاشی مجبوریوں کے ہاتھوں تنگ آکر جسم فروشی اختیار کرتی ہیں نفرت کی بجائے ہمدردی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ "طلوع وغروب"، "رئیس خانہ"، "بدنام"، "کنجری" اور "سفید گھوڑا" ایسے ہی افسانے ہیں۔ معاشی مسائل کے شکار عمر رسیدہ لوگوں کے جذبات واحساسات کے حوالے سے "الحمد اللہ"، "کفن دفن"، "پاگل موچی" اور "وحشی عورت" کی نشاندہی کی گئی ہے جب کہ افسانہ "سناٹا" کے تجزیے کے مطابق تمام مسائل کی جڑ معاشی بدحالی ہے۔ نیز معاشی تناظر پر مبنی افسانوں میں "ننھے نے سلیٹ خریدی"، "خربوزے"، "چور" اور "پاؤں کا کانٹا"

شامل ہیں۔ ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد"، "سپاہی بیٹا"، "بابانورا"، "ہیرا"، "راجے مہاراجے"، "اسلام علیکم" اور "ماتا" میں معاشی بدحالی، اخلاقی اور نفسیاتی بحران کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

عبد اللہ حسین کے افسانوں کے لیے گئے جائزے کے مطابق ان کے افسانوں میں ہجرت کا حوالہ زیادہ ملتا ہے جس کے اسباب تہذیبی، فکری اور سیاسی ہیں لیکن زیادہ تر خود اختیاری ہجرت کا غلبہ ہے جو کہ معاشی خوشحالی کے لیے کی گئی جو انسان کو خوشحال تو کر رہا ہے لیکن ساتھ میں اداسی اور دلگرفتی سے بے حال بھی کر رہا ہے لیکن پھر بھی انسان اپنی بنیادی ضرورت محبت اور رفاقت کی بجائے اشیا کو فوقیت دے رہا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد اس نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں:

> "ان کے افسانوں میں بہت بڑا حوالہ 'جلاوطنی' کا ہے، یہ ایک اور طرح کی ہجرت ہے جس کا تجربہ بہت سے پاکستانی کر رہے ہیں، اس کے اسباب تہذیبی، فکری اور سیاسی بھی ہیں، مگر غالب وجہ فکر معاش ہے یا معاشی خوشحالی کی آرزو، جو ایک بڑی تعداد میں پاکستانیوں کو دیار غیر میں جا بسنے پر اکساتی ہے۔۔۔ دیار غیر میں جس طرح یہ آفاقی حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آج کا انسان بنیادی طور پر تنہا اور دلگرفتہ ہے۔۔۔ اور صنعتی ترقی کا میکانکی خبر نامہ معاشرے کو خوشحال اور فرد کو بے حال کیے جا رہا ہے۔"[۵]

معاشرت / سماج:

معاشرت کے ذیل میں لیے گئے جائزوں کے مطابق احمد ندیم قاسمی کا افسانہ زیادہ تر دیہاتی زندگی، رنگوں اور مسائل پر مبنی ہے اور یہ دیہاتی زندگی ان لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے جو مفلوک الحال اور صدیوں سے استحصال کا شکار ہیں۔ دیہات کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کے پس منظر میں پنجاب کے دیہات کے پودے، دریا، چشمے، جھرنے، گرمی، سردی، جاڑے، برسات کے مناظر کے ساتھ وہاں کے لوگوں کی طرز زندگی کا بیان ملتا ہے بل کہ قاسمی نے دیہاتی زندگی کے ہر ہر پہلو کو بے نقاب کیا۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے دیہی معاشرے کے سنگین حقائق جیسے افلاس، توہم پرستی، تعویذ گنڈوں پر یقین، کم علمی، عدم مساوات، ظلم، نا انصافی، خودداری، عزت نفس جیسے مسائل "چوری"، "سونے کا ہار"، "شعلہ نیم خوردہ"، "رئیس خانہ"، "کنجری"، "بیٹے بیٹیاں" اور "عاجز بندہ" میں بیان کیے۔ معاشی مسائل کے حوالے سے "ننھے نے سلیٹ خریدی"، "الحمد اللہ"، "کنگلے"، اور "طلوع و غروب" جیسے افسانے قابل ذکر ہیں جبکہ توہم پرستی، پیری فقیری، ضعیف الاعتقادی اور کم علمی جیسے مسائل کا احاطہ "کوہ پیما"، "پیپل والا

تالاب"، "بین"، "چبھن"، "ماسی گل بانو" اور" ایک راستہ چوپال پر" نامی افسانوں میں کیا ہے۔طبقاتی استحصال، رسم و رواج ،خوداری، مفلسی کے ہاتھوں غیرت کا رفتہ رفتہ بے غیرتی میں تبدیلی، علاقائی کھیل، مذہبی رواداری، عظمت آدم، رواداری، انسان دوستی جیسے موضوعات کا احاطہ افسانہ "جوتا"، "وحشی عورت"، "رئیس خانہ"، "گنڈاسا"، "ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد" اور" پرمیشر سنگھ" میں کیا گیا ہے۔ افسانہ "ٹریکٹر" میں اس سوچ کی نفی ملتی ہے کہ مشینیں انسان سے ہر حال میں انسانیت چھین لیتی ہیں بلکہ مشینیں جہاں پرانے رشتوں کو توڑتی ہیں وہیں نئے حالات میں ان رشتوں کو استوار بھی کرتی ہیں۔ داخلیت پر مبنی افسانے "مائیں" کا موضوع ماں کی محبت کے ساتھ ساتھ پرانے محلے کی عورتوں کی وضعداریوں پر مبنی ہے۔افسانہ "پہاڑوں کی برف" میں نسوانی حسن کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ پرانے محلوں کی عکاسی ملتی ہے۔ دو لڑکیوں کی محبت و اخلاص پر مبنی کہانی "گڑیا" میں زمین دار کی لڑکی کو مزارع کی لڑکی سے دوستی سے منع کیا جاتا ہے۔ افسانہ "عقل" میں پیروں، فقیروں اور تعویذ گنڈوں کی رسمیات کو جب نوجوان نسل نہیں مانتی تو اسے بے ادب اور بدلحاظ کہا جاتا ہے نیز خود پسند کی شادی کرنے کے باوجود بیٹے کی اپنی مرضی سے شادی کرنے پر بدلحاظ کہہ کر قدیم نسل کے رویے کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ افسانہ "پاگل" جدید دور کے مسائل کا احاطہ کرتا ہے جیسے کہ قومی کلچر بین الاقوامی کلچر کے ہاتھوں شکست وریخت کا شکار ہے اور یہ کہ حرام مال کما کر خود کو معزز ظاہر کرنے والوں کو معاشرے میں کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے جب کہ "ماِمتا" کا تجزیہ دیہاتی معاشرت اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے ملتا ہے۔ "سناٹا" افسانہ بظاہر تو مشرق کے نظام معاشرت کی خامیوں جیسے شرافت، بے بسی، لاچاری اور مفلسی پر مبنی ہے تو بباطن معاشی اور سیاسی بحران کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے جس کا حل مناسب معاشی منصوبہ بندی ہے۔

ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے انتظار حسین کے ابتدائی دور کے افسانے جیسے "آم کا پیڑ"، "بن لکھی رزمیہ"، "خرید و حلوا بیسن کا"، "روپ نگر کی سواریاں" اور "چوک" تقسیم سے قبل کے تہذیبی و معاشرتی رشتوں پر مبنی ہے ان افسانوں میں تقسیم سے قبل کے معاشرتی زندگی کے کوائف ملتے ہیں۔ ذوالفقار احسن کے مطابق:

"۔۔۔اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں، گلی محلے کی عمارتوں، پتنگ بازوں، کبوتر بازوں اور پنواڑی کی دکانیں امام بار گاہیں، قوالی کی محفلیں اور اسی طرح کی معاشرتی زندگی کے کوائف کو بیان کرنے کی کامیاب و کامران کوشش ہے۔"(٦)

انتظار حسین کے افسانوی مجموعے "نئے پرانی کہانیاں" کو بھی سماج کے تناظر میں دیکھا گیا ہے جس میں "ملکہ سبا اور سلیمان"، "قصہ سکندر اور ذالقرنین"، "ناگ نامہ"، "چکوے نے چکوی کو کیا کہا"، "پری کے عشق میں"، "کاگا تنتر" اور "چوہے کی بادشاہی" کا جائزہ سیاسی تناظر میں لیا گیا ہے جب کہ "آستک رشی"، "رشی اور چڑیا"، "رشی قصائی"، "ماں ہرنی باپ برہمچاری"، "جب تم ہنس ہنسنی تھی"، "پورن کی واپسی"، "راجہ رسالو نے کیا کھویا کیا پایا"، "دولہا ملا تو ایسا" اور "چھیلا چنبیلی" آدمی کی قلت، تعصب، ظلم، تکبر، تہمت لگانا، مادیت پرستی جلد بازی، عورت کے حقوق کی پامالی وغیرہ کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اور "خوشبو چور"، "راج ہنس سونے والا" اور "مہاتما بدھ" اخلاقیات کے موضوعات پر مبنی ہے۔

عبد اللہ حسین کے افسانوں کا اہم حوالہ ہجرت ہے۔ جس کے در پردہ وجوہات فکری، معاشی و تہذیبی اور سیاسی ہی ہیں۔ "ندی"، "سمندر"، "دھوپ"، "جلاوطن"، "مہاجرین"، "رات" عبد اللہ حسین کے ایسے ہی افسانے ہیں۔ عبد اللہ حسین کے افسانوں پر بحث کے مطابق ان کے افسانے مقامی تہذیب و تمدن، ہمارے اقدار، روزمرہ کے سماجی معاملات کے ساتھ دوسری دنیاؤں کے تہذیب و کلچر، بھوک، موت، محبت، باطنیت، طبقاتی تقسیم، نسلی امتیاز جیسے مسائل کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ انیل سموئیل کے عبد اللہ حسین کے افسانے "ندی" پر بحث کے مطابق عصری حسیت کے اظہار کے لیے بلانکا کا کردار استعمال کیا گیا ہے کیونکہ انیسویں اور بیسویں صدی کو جس طرح روس کے ٹالسٹائی، دوستوفسکی اور پسترناک جیسے نابغہ روزگار نے متاثر کیا وہیں بلانکا بھی ان متاثرین میں شامل تھی مذہبی تعصب جو آج بھیانک ترین انسانی مسئلہ ہے کو بیسویں صدی میں بھانپ لیا گیا تھا اور اس حوالے سے افسانہ "ندی" میں بلانکا کا بے لاگ تبصرہ بھی موجود ہے۔

تہذیب:

ادبیات کے مجلوں میں تہذیبی حوالے سے احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور عبد اللہ حسین کے افسانوں کو زیر بحث لایا گیا ہے ان مباحث کے مطابق احمد ندیم قاسمی کے افسانے دیہاتی معاشرت کے ساتھ پنجابی تہذیب و ثقافت کو بھی عمدگی سے پیش کرتے ہیں جیسے "ماممتا" کے افسانے کے مطابق پنجاب میں آج بھی سر درد کی صورت میں روغن بادام کا استعمال کیا جاتا ہے اور مصیبت میں بچے ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھتے ہیں جب کہ انتظار حسین کے فکشن پر ان کی بستی ڈبائی کی تہذیبی، لسانی اور ثقافتی منظر نامے کا غلبہ ہے۔ "مایا"، "آخری آدمی"، "زرد کتا"، "کایا کلپ"، "کشتی"، "شہر افسوس"، "کچھوے" اور "خیمے سے دور" کی کامیابی میں افسانہ نگار کی کی زبان اور تکنیک کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ سجاد باقر رضوی کے مطابق:

"انتظار حسین کی زبان پرانے عہد نامے اور داستانوں کی سلیس و سادہ زبان ہے۔اس زبان کا ایک جواز تو یہ ہے کہ یہ کہانی کی زبان ہے اور دوسرا جواز یہ ہے کہ اس معنی خیز علامتوں کا ایک بہت بڑا خزینہ ان کے ہاں آیا جو ہمارا وہ تہذیبی ورثہ تھا جسے ہم نے تقریباسو سال تک رائج الوقت نہ کیا۔"(۷)

عبد اللہ حسین کے افسانے "فریب" کا ذکر بھی تہذیب و روایات کے ضمن میں کیا گیا ہے اس افسانے کے مطابق جدید صنعتی نظام سے ہمارے تہذیب کو خطرات لاحق ہیں۔

نفسیات:

ادبیات کے مضامین میں نفسیات کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور عبد اللہ حسین کے افسانوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ان مباحث کے مطابق سیاست، معیشت اور رومان اگرچہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوی فن کے اہم ابھار ہیں تاہم ان کے یہاں نفسیاتی حوالہ بھی ملتا ہے۔ان کے یہاں بچوں کی معصومیت، ان کی نفسیات، جذبات، خوشیوں اور غموں کا، ممتا کے جذبے کے تحت ماؤں کی نفسیات جب کہ معاشی مسائل کا شکار عمر رسیدہ طبقے کے جذبات و احساسات کا بیان بھی ملتا ہے اور دیہی و شہری دونوں سماج پر مبنی افسانوں میں جنریشن گیپ کے مسائل ملتے ہیں نیز شہری اور مٹروپولیٹن کلچر کی نمائندگی کرتے افسانوں میں شہری سماج کی ذہانت، مکاری، خود غرضانہ سوچ، منافقت اور مصنوعی طرز زندگی کے رخ نمایاں ہیں۔احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی عورتوں کے نفسیاتی الجھنوں کا سبب یا تو معاشی ہوتا ہے یا پھر سماجی روایات جیسے کہ "سناٹا"، "ماسی گل بانو"، "مامتا"، "ماں"، "سپاہی بیٹا" اور گنڈاسا" کرداروں کے نفسیاتی مسائل کے سبب یہی وجوہات ہیں۔جنگی موضوعات پر مبنی افسانے دکھاتے ہیں کہ کیسے سیاسی اور معاشی مسائل اخلاقی اور نفسیاتی بحران کا سبب بن رہے ہیں۔

انتظار حسین کے یہاں افسانہ فراموش میں انسانی نفسیات کے اس رخ کی جانب اشارہ ملتا ہے کہ چیزوں کے ساتھ نسبتیں انہیں محترم بناتی ہے جب تک انسان زندہ ہوتا ہے تب کسی چیز کی اہمیت نہیں ہوتی، اس کے جانے کے بعد اس کی چیزیں بھی محترم اور عزیز ہو جاتی ہیں۔افسانہ "بادل" بچوں کی معصومیت اور افسانہ "فراموش" بچوں کے کھیل کود کی نفسی معنویت پر مبنی ہے۔افسانہ "۳۱ مارچ" اور "قدامت پسند لڑکی"، "پتے"، "خیمے سے دور"، "پورا گیان" اور "نر ناری" مرد عورت کے فطری کشش کے موضوع پر مبنی ہیں جب کہ افسانہ "اسیر" اور نیند" کرداروں کے نفسی و نفسیاتی الجھنوں کا احاطہ کرتے ہیں۔افسانہ "کچھوے"

کے متعلق ضیاء المصطفی ترک یوں رقم طراز ہیں کہ "کہانی کی بنت مظاہر فطرت کے کرداری تشکیل سے کی گئی ہے۔ میری رائے میں اس کا موضوع گیان اور اگیان، خبر اور بے خبری کے مابین جھولتی ہوئی عمومی انسانی نفسیات ہے"[۸] اس افسانے کا اختتام موہ مایا کے غالب آنے کے المیے پر مبنی ہے۔ ہندی اساطیری روایت پر مبنی دوسرا افسانہ "پتے" مرد اور عورت کے مابین جبلی کشش کے موضوع پر مبنی ہے۔ جس سے یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان کی بشری کمزوریاں بالاخر اس پر غالب آ ہی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صابر حسین جلیسری "آخری آدمی" پر فلسفہ، منطق اور تحلیل نفسی کے روشنی میں بحث کرتے ہیں۔ افسانے کا موضوع "السبت" کے قانون سے اخذ کیا گیا جس کے مطابق نافرمانی کے بدولت انسان کی ہئیت تبدیل ہو کر بندر میں بدل جاتی ہے اور آخری آدمی جو اپنے سامنے ان کو بندر میں تبدیل ہوتا دیکھ کر خود بھی آخر میں بندر بن جاتا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق انتظار حسین کا یہ افسانہ نظریہ جبر و قدر کی تشریح کچھ یوں کرتا ہے کہ "انسان کے منفی اعمال اس کی ذات کے زاویے بدل دیتے ہیں۔ انسان اعمال پر قادر ہے مگر مکافات عمل پر قادر نہیں وہ اس تبدیلی کے مانع آنے پر قادر نہیں۔ یہ جبر کا نظریہ ہے"[۹] مختصراً انتظار حسین اس افسانے میں نظریہ جبر و قدر کے ذریعے انسان کے معکوسی سفر کی وضاحت کرتے ہیں جو ارتقا کا زوال ہے۔ جبر و قدر کا قانون جو کہ قانون فطرت ہے اور کوئی انسانی تدبیر اس کو روک نہیں سکتی۔

عبد اللہ حسین کے افسانوں پر نفسیاتی تناظر میں بحث کے حوالے سے ایک ہی مضمون ملتا ہے اس بحث کے مطابق افسانہ "سمندر" میں جنسی نفسیات اور بے گھری کے دکھ، المیوں اور کیفیات کو افسانے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ انیس اکرام فطرت کے مطابق:

> "انسان کی زندگی کی محرومیاں اور لاحاصلیاں نوع بہ نوع اور لاتعداد ہو سکتی ہیں مگر محبت اور حیات انسانی کی اصل بنیاد اور بقا کی ضامن جنسی محبت کی تشفی سے متعلق محرومیاں لاحاصلیاں دل و جان کا روگ بن کر باطنی آلاؤ کو سدا روشن رکھتی ہیں۔ خواہ انسان کا بدن گریز پا رہے، ذہنی اور نفسیاتی جولانیاں ہمہ وقت سر اٹھاتی رہتی ہیں کچھ ایسا ہی مسئلہ سمندر کے مرکزی کردار فیروز کا ہے۔"[۱۰]

مضمون نگار کے مطابق مصنف نے جس مہارت، مشاہدے اور باریک بینی سے فیروز کی ذہنی و نفسیاتی انتشار، جھنجھلاہٹ اور ہیجان کو سمندری طوفان کی بلاخیزیوں کے ذریعے کامیابی سے بیان کیا ہے اس سے "موبی

ڈک"،"اولڈ مین اینڈ داسی"،"یولیسیس"،"رہائم آف دی این شٹ میر ینز" جیسے کلاسیکی شاہکاروں کی طرف دھیان جاتا ہے۔

وجودیت:

وجودیت کے حوالے سے لیے گئے جائزوں کے مطابق انتظار حسین وجودیت کے فلسفے کے متاثرین میں سے تھے اور اس فلسفے کے اثرات ان کے افسانوی مجموعے "آخری آدمی" کے افسانوں میں محسوس کیے جاسکتے ہیں جو کہ ہجرت کے دنوں میں گم اس انسان کی تلاش پر مبنی ہے جو اقدار،افکار اور آدرشوں کے سہارے زندگی بسر کرتا تھا۔یوں اس دور کی کہانیوں کا موضوع اقدار اور آدرشوں کے شکست وریخت اور اس بحران کا شکار انسان کی کہانیاں ہیں۔ڈاکٹر اقبال آفاقی کے بقول انتظار حسین نے وجودی فلسفے کے زیر اثر اپنے موضوع کے بیان کے لیے بہت سے وجودی مفکرین جیسے "دوستو وسکی،کافکا،میلر اکس،موراویہ،سیموئیل بیکٹ،سارتر اور کامیو بہت سے نام ہیں جن سے اس نے کسب فیض کیا [۱۱]۔انتظار حسین کے افسانے "اندھی گلی" پر ہائڈیگر کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں کہ جب واضح موت کا رومانی تصور اور زندہ رہنے کی حیوانی جبلت جیسے رویے فرد کی ذات کا حصہ بن جاتے ہیں۔اس صورت حال کو ہائیڈیگر پھینک دیے جانے کے برابر قرار دیتے ہیں اور فرائیڈ کا نظریہ موت وحیات اس صورت حال کو سمجھنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ ایسے میں سارتر کے No Exit کی طرح تاریخ کی ان اندھی گلیوں سے نکالنے کے لیے نہ کوئی اوتار آیا اور نہ ہی کوئی معجزہ رونما ہوا۔اقبال آفاقی کے مطابق:

> "انتظار کا اصل مسئلہ وجودی شناخت کا ہے۔اس کی توجہ اس انسان کی صورت حال پر ہے جو تاریخ اور جغرافیے سے الگ ہو کر اپنے اصل معنی ومفہوم سے محروم ہو چکا ہے۔ایسے سزا یافتہ لوگوں کی کہانیاں انتظار کا مقدر ہے جن کی اپنے وعدے سے روگردانی کی سزا میں جون بدل گئی۔ایک شخص جس پر ہزار ریاضت کے باوجود کتا حاوی ہو گیا۔ایک شخص کہ اپنی پرچھائیں کو تلاش کر رہا تھا۔وہ شہزادہ جو مکھی کے قالب میں اتر گیا۔وہ کہ جس کی ٹانگیں بکری کی تھیں۔وہ عورت جو بچھل پائی تھی۔بتنے جو کشتی کرتے۔اور پھر ہاتھی کے کان والے کا ذکر۔"[۱۲]

ہجرت کے دنوں کے گم شدہ انسان کا نوحہ میٹا سٹوری فارم میں لکھنے کی وجہ سے وہ آئرش وجودی مفکر سموئیل بیکٹ کے قریب نظر آتے ہیں۔پہچان کا آشوب کافکا کے میٹا فورسز کی طرف متوجہ کرتا ہے۔انتظار حسین کے

افسانوں میں جو پہچان کے آشوب سے بچ جاتا ہے اسے وقت کا جبر کہا جاتا ہے۔ آدمی کی یہ موت غیر آدرشی صورت حال کے تاریخی جبر کا نتیجہ ہے۔ اسی وجہ سے انتظار حسین کے افسانوں "اندھی گلی"، "دیوار"، "آخری آدمی"، "زرد کتا"، "وہ جو کھوئے گئے"، "وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے"، "شرم الحرم"، "پرچھائیں"، "ٹانگیں"، "کانا دجال" اور "کٹا ہوا ڈبا" پر منفیت اور عدمیت کے تصورات چھائے ہوئے ہیں۔ انتظار حسین وجودی فکریات کے لیے مغرب اور مشرق دونوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ جدیدیت کے مضامین جیسے تنہائی، بے سمتی، تشکیک، فراریت اور لافردیت کے لیے اسلامی تہذیب کے دائرہ معارف سے استفادہ کیا گیا ہے۔ وہ صوفیا کی طرح کسی لوک کہانی یا Fable کے نازک موڑ کو لے کر قدیم کو جدید اور معلوم کو نامعلوم سے ملا کر کہانی کو ایک وسیع تر استعارے میں بدل دیتے ہیں۔ انتظار کے یہاں اجتماعی لاشعور کے بازیابی کے لیے یونگ کے آرکی ٹائپ سے مدد لی گئی ہے۔ جبکہ داخلیت، مونولاگ اور منفیت مہاجرت کے تجربے اور معروضیت میں پھیلی بے بسی اور لاشیئت کا نتیجہ ہے۔ کہانیوں کے ٹکنیک اور فارمیٹ کے لیے آندرے بریطون کے سرئیلزم سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ذاتی علامتوں کی بجائے اسلامی تہذیبی روایات سے علامات و استعارات اخذ کرتے ہیں۔ جس سے تفہیم میں آسانی کے ساتھ معنوی حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیئر کے بحث کے مطابق انتظار حسین انسان کے وجودی اور سیاسی مسائل کے لیے ماضی کی کتھا روایت سے استفادہ کرتے ہیں۔ جسے نو آبادیاتی قوتوں نے مشرق کے توہمات کی ذیل میں رکھ کر مسترد کر دیا تھا یوں مشرقی کلاسیکی فکشن یورپی فکشن کا غیر ٹھہرا لیکن انتظار حسین انسان کے وجودی سوالات کے جوابات کے لیے ثقافت اور فرد کی نمائندگی کے طور پر کتھا کی روایت کو افسانے کا حصہ بناتے ہیں اور اس کے لیے ہندی، عجمی اور سامی روایات سے استفادہ کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں میں 'غیر' کی شناخت اور اسے سامنے لانے اور مکالماتی رشتہ قائم کرنے کی بنیادی صورت 'یاد' ہے مثلاً:

> "'آخری آدمی' میں الیاسف اپنے ہم جنسوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور بنت الاحضر کو یاد کرتا ہے؛ 'زرد کتا' میں ابو حضری شیخ عثمان کے ملفوظات اور اپنے چار ساتھیوں کے طرزِ عمل، مزعفر اور زن رقاصہ کو یاد کرتا ہے؛ 'شہر افسوس' کے تینوں کردار اپنے اپنے عمل کو یاد کرتے ہیں؛ 'نرناری' میں مدن اپنی چوک کو، اور دھاول اپنے کھوئے ہوئے دھڑ کو یاد کرتا ہے۔ 'کچھوے' میں ودیا ساگر تتھاگت کی کہانیاں یاد کرتا ہے۔۔۔ یاد ہمارا دھیان اس جانب دلاتی ہے جو ہماری زندگی سے غائب اور گم ہے؛ یاد

میں شے کی اولین موجودگی اور گم شدگی کا تناقض پایا جاتا ہے۔اولین موجودگی ہی'اصل'کے طور پر اپنا تعارف کرواتی ہے، ان تمام اشیا،واقعات اور افراد کو دھکیل کر باہر کرتی ہوئی، جو اولین موجودگی اور اس کے زندہ، بھرپور تجربے پر پردہ ڈالتے ہیں۔یہ تمام اشیا، واقعات اور افراد اصل میں 'غیر' ہیں۔جنہوں نے حقیقت کے اولین موجودگی سے ہمارے رشتے میں کھنڈت ڈالی ہے اور ہمیں بندروں اور مکھیوں میں بدل دیا ہے۔"(۱۳)

انتظار حسین کے افسانوی مجموعے "گلی کوچے" اور "کنکری" میں معاشرتی ٹوٹ پھوٹ اور معدومیت کا تصور سامنے آتا ہے۔افسانے "آخری آدمی"، "زرد کتا"، "پرچھائیں"، "ٹانگیں" اور "ہڈیوں کا ڈھانچ تمثیلی انداز میں وجود کی ماہیت، اخلاقی و روحانی زوال پر مبنی ہیں۔افسانہ "سیڑھیاں" میں خواب دیکھنے کی صلاحیت کے فقدان یا یاداشت کی گمشدگی کو موت قرار دیا گیا ہے۔افسانہ "اپنی آگ کی طرف" کے مطابق روایت سے کٹنے اور انحراف کے نتیجے میں وجود سالم نہیں رہتا اور شکست و ریخت مقدر بن جاتا ہے۔افسانہ "وہ جو کھوئے گئے" میں جہاں حافظے کی معدومیت المیہ کا باعث تھا تو "شہر افسوس" میں حافظے کی موجودگی بحران کا باعث ہے۔مختصراً ڈاکٹر ناہید قمر کے مطابق:

"انتظار حسین کی تحریروں میں انسان اپنے وجود کا راز جاننے کی جستجو کرتا ہے۔اس کوشش میں وہ کبھی تاریخ واساطیر کی معرفت گزرے ہوئے وقت کے چہروں میں خود کو تلاش کرتا ہے۔تلاش و جستجو کی یہ زنجیر گزشتہ کو موجود و آئندہ سے منسلک کرتی ہے۔۔۔ان کی کہانیوں میں اپنے عہد کا آشوب، اقدار کا زوال، تہذیبی اکھاڑ پچھاڑ پوری شدت سے نمایاں ہے۔اپنی زمینوں سے نکال دیے گئے لوگ، مہاجرت کے مرحلے، جڑوں سے اکھڑنے کی کیفیت، ذہنی جلاوطنی، اقدار کا بکھراؤ اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والا اخلاقی زوال انتظار حسین کے چند بنیادی موضوعات ہیں۔مگر وہ اپنے عہد کے آشوب کو کسی تاریخی اور اساطیری صورت حال سے ملا دیتے ہیں۔اس طرح اس آشوب کا معنوی دائرہ پھیل جاتا ہے۔"(۱۴)

جدیدیت:

۱۹۶۰ء کی دہائی میں تجریدی اور علامتی انداز روش کے تحت جدید افسانہ لکھا جانے لگا۔ جس نے معاشرتی شکست وریخت کے باطن وروح پر اثرات کو موضوع بنایا۔ انتظار حسین نے بھی داستانوی رنگ میں بیانیہ علامتی افسانے لکھ کر اپنا مخصوص اسلوب متعارف کرایا اوراس دور کے سب سے اہم رجحان کو شعوری سطح پر برت کر ہجرت، مایوسی، ڈر، خوف کی نفسیات، مذہبی اور اخلاقی اقدار کی شکست وریخت، تقسیم کے بعد کی سیاسی وسماجی صورت حال، ماضی کی بازیافت، اساطیر، تاریخ، قصے، تصوف اور انسان کا درجہ انسانیت سے گر حیوان کی جون میں تبدیلی جیسے مخصوص موضوعات کی عکاسی کی۔ داستانوی طرز کے لیے عہد نامہ قدیم کی فضا، گوتم بدھ اور حضرت محل کے حوالے سے تراکیب ولفظیات، مختلف علامات جیسے طوفان، مچھلی، کشتی کے لیے قصص الانبیا، گلگامش کی داستان، ہندی دیومالائی قصے کہانیوں اور حاتم کے قصے سے مدد لی گئی۔ انتظار حسین کے ابتدائی مجموعے "گلی کوچے" اور "کنکری" کے افسانوں کا موضوع تقسیم، فسادات، ہجرت، ماضی کی یاد اور تہذیبی بکھراؤرہا جب کہ افسانوی مجموعہ "آخری آدمی" کی کہانیوں میں ہجرت کی یادوں کے ساتھ انسان کے داخلی کرب، خوف، تنہائی اور اخلاقی زوال جیسے جدید معاشرتی پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں "آخری آدمی"، "زرد کتا"، "کایا کلپ" اور "سوئیاں" داستانوی اور اساطیری پیرائے میں انہی موضوعات پر مبنی ہیں۔ افسانوی مجموعہ "شہر افسوس" کی کہانیوں میں علامتوں اور استعاروں کی زبانی ہجرت، زوال ڈھاکہ، بے سمتی اور شناخت کے گم ہونے کی نشاندہی کی۔ "کچھوے"، "خیمے سے دور" اور "خالی پنجرہ" میں شامل کہانیوں مثلاً "کچھوے"، "پتے"، "واپس"، "برہمن بکرا"، "نر ناری"، "دسواں قدم"، "پچھتاوا"، "بندروں کی کہانی"، "نرالا جانور"، "طوطے مینا کی کہانی" اور "مور نامہ" میں جاتک کہانیوں اور ہندوستان کے لوک داستانوں کے تناظر میں آج کے حالات کی عکاسی ملتی ہے۔

نوآبادیات:

ڈاکٹر گل عباس اعوان مضمون "مامتا" میں افسانے کو نوآبادیاتی تناظر میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "بڑے افسانے کی کہانی میں تاریخ بھی بول رہی ہوتی ہے۔ نوآبادیاتی قوتیں جہاں جہاں بھی ہوتی ہیں مقامی لوگوں کا استحصال کرتی ہیں۔ پرانے ہانگ کانگ بھی افسانے کے واحد متکلم کو یہی بتاتے ہیں کہ ہانگ کانگ تو پولیس کی جنت ہے۔ کولون اور اصلی چین کی سرحد پر ہر آنے والے چینی مسافر کی تلاشی لو اور اس کا بوجھ ہلکا کر کے اسے چین میں دھکا دے

دو۔ یا پھر کسی مقامی لڑکی کو اٹھا کر بیرک میں لے جاؤ اور سارجنٹ کا چھاپہ پڑنے پر، لڑکی کو سارجنٹ کے حوالے کر دو۔"(۱۵)

رومانیت:

۲۰۱۵ء سے لے کر ۲۰۲۰ تک کے ادبیات کے مجلے جہاں تخلیق کاروں کے فن افسانہ نگاری کے جائزہ فکری حوالے سے لیا گیا ہے وہیں رومانویت کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کو دو مضامین میں دیکھا گیا ہے۔ ایک مضمون میں ڈاکٹر ناہید قاسمی کے مطابق احمد ندیم قاسمی کے یہاں رومانویت کے حوالے سے ہر رنگ موجود ہے خاص محبت کے موضوع پر قاسمی کے تقریبا ۳۵ افسانے موجود ہیں لیکن مضمون میں ناہید قاسمی نے اس حوالے سے افسانہ "بے گناہ"، "مسافر"، "حق بجانب"، "بوڑھا سپاہی"، "طلائی مہر"، "طلوع و غروب"، " گونج"، "الجھن"، "غریب کا تحفہ"، "گنڈاسا"، "ماتم"، " جن و انس"، "بھرم"، "بھاڑا"، "تبر"، "بے نام چہرے"، "عالاں" اور "چرواہا" پر نظر ڈالی ہے جبکہ پروفیسر فتح محمد ملک حسن و محبت کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی کے فن پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> "ندیم کے نزدیک حسن فرد کے جذباتی اور روحانی زخموں کے لیے مرہم اندمال ہے تو معاشرتی اور تہذیبی روگوں کے لیے زبردست قوت شفا ہے۔ ندیم گردوپیش کی دنیا میں حسن کی ناقدری اور پامالی سے بچانے کی جدوجہد کو بھی حسن کاری کا ایک ناگزیر تقاضا مانتے ہیں"(۱۶)

احمد ندیم قاسمی کے جذبہ عشق پر مبنی افسانوں کے کردار معاشرتی احتساب کے شکار ہیں پروفیسر فتح محمد ملک اس حوالے سے احمد ندیم قاسمی کے افسانے "گنڈاسا"، "موج خون"، "بے نام چہرے"، "ایک احمقانہ محبت کی کہانی"، "جن و انس" اور "پہاڑوں کی برف" کو زیر بحث لاتے ہیں۔

اسلوب:

محمد عاصم بٹ انتظار حسین کے افسانوی اسلوب کو زیر بحث لاتے ہیں جس کے مطابق انتظار حسین اردو کے کلاسیکی داستانوں، ملفوظات کے ادب، قدیم نثری اسالیب، سنسکرت کلاسیکی اور ہندی کتھاؤں کو برت کر ایک نئی ترکیب بنائی جس کی جھلکیاں "آخری آدمی" کی کہانیوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ محمد عاصم بٹ، انتظار حسین کے اس نئے اسلوب کے متعلق کچھ رقم طراز ہیں کہ:

"آپ نے اردو فکشن کو جتنے اسالیب دیے اس کی مثال بھی ہمیں کسی دوسرے فکشن نگار کے ہاں نہیں ملتی۔ چاہے وہ ملفوظات کا روحانی مکالمے کا رنگ ہو، یا انجیل کا بلند روایتی آہنگ، یا داستانوں اور کتھاؤں کی اسرار بھری طرز ہو، انتظار حسین نے ان اسالیب میں رچ بس کر انہیں اردو فکشن کا حصہ بنایا۔"(۱۷)

ب۔ناول پر مبنی آرٹیکل

مابعد الطبیعات:

انتظار حسین کے ناول "بستی" میں وقت کے تین دائرے ملتے ہیں۔ اصولوں کا پابند قدیم وقت، روپ نگر میں ذاکر کے بچپن کا وقت، لاہور میں ذاکر کی زندگی۔ وقت کے یہ تینوں دائرے الگ الگ ہونے کے باوجود ذاکر کی یادوں میں ایک دوسرے پر Over lap کرتے ہیں۔

"مسلمانوں کے فلسفہ ادب میں زیادہ تر زمان ہمیں سیدھے خط پر سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے اور ہندو ذہن وقت کو دائرے میں محسوس کرنے کا عادی ہے انتظار حسین وقت کے دائرے میں گھومنے کے چکر کو زیادہ اہم جانتے ہیں۔"(۱۸)

یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کے کردار گھوم پھر کر اسی سیچیویشن میں آجاتے ہیں جہاں سے انہوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا ہوتا ہے۔ یوں "بستی" کے کرداروں کو سقوط مشرقی پاکستان کے وقت تقسیم سے قبل کے وقت کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور "تذکرہ" میں کراچی کی درپیش صورت حال سے نکلنے کی کوئی راہ سجائی نہیں دیتی۔ سراج منیر ناول "بستی" میں وقت کی پانچ سطحوں کی نشان دہی یوں کرتے ہیں "۱۔ ہبوط آدم کا لمحہ ۲۔ ہند اسلامی تہذیب کا زمانہ ۳۔ آریائی وقت ۴۔ اسلامی تاریخ میں وقت کی جہت ۵۔ عام زندگی میں وقت کا بہاؤ"(۱۹)۔ ڈاکٹر غفور قاسم شاہ کے مضمون کے مطابق ناول "تذکرہ" میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے پیش کیے گئے ہیں۔ قراۃ العین حیدر کی طرح انتظار حسین کے یہاں بھی وقت کی جبریت کا احساس ملتا ہے جو انسان کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔

اختر رضا سلیمی کے ناول "جاگے ہیں خواب میں" کا موضوع انسان، خدا اور کائنات سے متعلق فلسفیانہ سوالات پر مبنی ہے۔ ناول میں ہیرو کے جنیاتی حافظے کا سلسلہ تاریخ اور مابعد التاریخ سے جوڑنے کے ساتھ ساتھ کائنات کے سربستہ رازوں کی تفہیم بھی ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔ ناول میں لڈوگ بولڈزمین (Ludwig Boltzman) کی بیسویں صدی کے آخر میں پیش کردہ وقت کے تیر (Arrow of Time) کی تھیوری کا

استعمال ملتا ہے۔ناول فرائڈ اور ژونگ کے خواب کے نظریات کے اثرات کا بھی حامل ہے۔ آخر میں ناول کے کردار پر یہ انکشاف ہو جاتا ہے کہ ہر وجود کا پنا ازل و ابد ہے اور اس حقیقت کو سمجھنا اس لیے مشکل ہو تا ہے کہ ہم نے وقت کی ماہیت کو فلسفہ، سائنس، مابعد الطبیعات اور مذہب کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے جبکہ حقیقت میں کائنات کی ہر شے کے لیے Time line اور Time Zone مختلف ہے۔ مختصراً اس ناول پر بحث کا خاتمہ اس نکتے پر کیا گیا کہ جہاں طبیعات کی حد ختم ہو جاتی ہے وہاں سے مابعد الطبیعات کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ سید زبیر شاہ کے مطابق:

> "یہ ناول جو تاریخ سے شروع ہو تا ہے، فلسفہ وقت اور فلسفہ موت کا احاطہ کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور نفسیات کے دائروں میں داخل ہو جاتا ہے۔ناول کے متن کا ہر جملہ یہ بتاتا ہے کہ مصنف غور و فکر کرنے والا تخلیق کار ہے۔۔۔جو وقت اور حیات و موت کی حقیقتیں دریافت کرنے نکلا ہے۔"(۲۰)

"جاگے ہیں خواب میں" کی طرح سلیم اختر کے ناولٹ "جندر" کا موضوع بھی موت اور وقت کا فلسفہ ہی ہے۔ محمد حمید شاہد، سلیم اختر کے "جاگے ہیں خواب میں" اور وحید احمد کے "زینو" کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> "وحید احمد اور اختر رضا سلیمی دونوں کے ہاں وقت تخلیقی سطح پر مسئلہ ہوا ہے بہ طور خاص وحید احمد کے ناول "زینو" اور اختر رضا سلیمی کے ناول "جاگے ہیں خواب میں" میں۔اس مسئلے نے ان دونوں ناول نگاروں کو نہ صرف مختلف کیا ہے، یہ دونوں اپنے اپنے متن کی بنت میں بھی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں۔"(۲۱)

"زینو" میں وحید احمد، ارسطو، زینو اور زینو کے والدین، سکندر اعظم اور ایما کے کرداروں کے ذریعے ماضی سے حال میں جست لگاتے ہیں اور حال میں تحسین، برٹن اینڈرسن اور ایوا جیسے کرداروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ان کرداروں کی دانش دراصل "ارسطو کے عہد کی دانش ہے جو لمحہ موجود کی طبیعاتی اور منطقی اصولوں والی دانش کے ساتھ ایک گرہ سے بندھ جاتی ہے"(۲۲) صلاح الدین پرویز کا ناول "نمرتا" وقت کے وسیع تر زمانی پس منظر کے حامل ناول میں دو علامتی کرداروں کے ذریعے پانچ ہزار برس کی تہذیبی اور تخلیقی زندگی کے سفر پر مشتمل ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کے ناول "قبض زماں" پر برگساں کے وقت کے داخلی تجربے کے فلسفے کے حوالے سے بحث ملتی ہے۔ برگساں کے مطابق وقت تبدیلی کا نام ہے لیکن یہ تبدیلی وقت کے اندر نہیں، بل کہ ہونے والی تبدیلی کو ہی وقت کہتے ہیں۔یوں دوری یا فاصلہ وقت کا ہی دوسرا روپ ہے۔

لیکن اصل وقت کو ہم ناپ نہیں سکتے اس کا صرف داخلی تجربہ کر سکتے ہیں اور اس داخلی تجربے کو برگساں کے فلسفے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ "قبض زماں" کے گل محمد وقت کے اسی داخلی تجربے کا شکار ہوا۔ یوں

"برگساں کے فلسفے کی روشنی میں 'قبض زماں' کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ خارجی وقت یا Mathematical Time کے ادھر اُدھر ہو جانے سے ہوا ہے۔ گل محمد کا تجربہ داخلی وقت کا تجربہ ہے۔ داخلی وقت کے تجربے کے بعد دوبارہ" خارجی وقت "میں آنا ہی اس کے لیے حیرت اور پریشانی کا سبب بنتا ہے ورنہ ممکن تھا کہ اصل وقت کے داخلی تجربے کے ساتھ جیتے رہنے سے وہ ولی یا مجذوب بن جاتا ہے۔"(۲۳)

یوں "قبض زماں" گل محمد کے روحانی اور وجودی کرب کو موضوع بناتا ہے۔ خالد جاوید کے مطابق:

"قبض زماں تو ایک تنہا انسانی روح پر گزرے ہوئے بظاہر ایک ناقابل یقین واقعے کے سبب ایک وجودی تجربے یا کیفیت کی کہانی ہے اور جس انداز میں بیان کی گئی ہے اسے تخلیقی ادب کی مابعد الطبیعات سے بھی عبارت کیا جا سکتا ہے"(۲۴)

خالد جاوید روحانی اور وجودی کرب کے حوالے سے سویڈن کے ناول نگار "پارلا گرکوئست " کے ناول "بارمباس" کا حوالہ دیتا ہے جس کی بنیاد بھی لوک کتھا پر رکھی گئی تھی۔ ان کے مطابق یہ ناول چوری کے الزام میں گرفتار کیے گئے بارمباس کے روحانی اور وجودی کرب کی داستان ہے جسے عیسیٰ کے ساتھ صلیب پر چڑھایا جانا تھا لیکن عین وقت پر معاف کر کے رہا کر دیا جاتا ہے۔

قراۃ العین حیدر کے "کار جہاں دراز ہے" سے لے کر "گردش رنگ چمن" تک کے تحریروں پر تصور زمان کے تناظر میں بحث کی گئی ہے۔ جدید فکشن میں تصور زمان (ایک خطی تصور ہے چاہے وہ دائروی ہو یا مستقیم) کو تقدیر کے معنوں میں لیا گیا ہے۔ جس طرح عہد جدید کے ہر انسانی مسئلے کی جڑیں تصور زمان میں پیوست نظر آتی ہیں اسی طرح قراۃ العین حیدر کے طرز احساس میں بھی اس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی ابتدائی تحریروں سے لے کر "گردش رنگ چمن" تک یعنی ناولوں، افسانوں اور رپورتاژوں میں ایک مربوط اور مسلسل ہمہ جہتی نمو پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریروں کی دنیا انسانوں کے باہم متصادم تقدیروں، بنتے بگڑتے مملکتوں کے نقشوں، عروج وزوال کے شکار خاندانوں، ایک دوسرے سے بچھڑتے اور قریب آتے نسلوں پر مبنی ہے۔ اس بحث کے مطابق تصور زماں کا دوری تصور "آگ کا دریا" میں ملتا ہے جب کہ تصور زماں کے

مستقیم جہت کو "کار جہاں دراز ہے" میں برتا گیا ہے۔ قراۃ العین حیدر کے یہاں تصور زمان و مکان کے تناظر میں عورت کی تقدیر کے حوالے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ تاریخ کی ضرب سب سے زیادہ عورتوں پر پڑتی ہے ان کی تقدیریں انہیں تنکوں کی طرح ایک سے دوسرے موج تک پھینک دیتی ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں شریف زادیاں، طوائف تو طوائف، اولیاء، ملازادیاں بین الاقوامی رقاصائیں، کامنی لڑکیاں گوریلا فائٹر، تو گوریلا فائٹر گودوں میں بچے کھلاتی پھرتی ہیں اور تحریکوں کی قیادت کرنے والی آخر میں کتوں کو چھیچھڑے کھلاتی نظر آتی ہیں۔ زمانوں اور نسلوں کے سفر کے باوجود عورتوں کی تقدیر انہیں Haunt کرتی رہتی ہے۔ ہر مزاج اور ہر انداز کا کردار رکھنے کے باوجود قراۃ العین کے یہاں نسائی دنیا کے باطن تک پہنچنے کی اہم ترین کلید طوائف کا کردار ہے۔ اردو فکشن میں قاضی عبد الغفار سے لے کر منٹو تک سب نے طوائف کے کردار کو تقدیری مطالعے کی بجائے سماج کی تنقید کا ذریعہ سمجھا۔ جب کہ قراۃ العین حیدر کے یہاں تہذیبوں کے عروج و زوال کا مطالعہ عورت کی تقدیر خاص طور پر طوائف کے حوالے سے ملتا ہے۔ یہ مطالعہ تصور زمان مستقیم اور دوری دونوں حوالوں سے ملتا ہے۔ مختصرا:

> "قراۃ العین حیدر کو غور سے پڑھ کر اندازا ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ایک مرکزی موضوع کی حیثیت سے طوائف کا مطالعہ ایک جامع سماجی مظہر کا مطالعہ ہے۔ طوائف تہذیب کا انفس بھی ہے اور اس کا آفاق بھی۔ اس کا باطن تہذیبی اور انسانی محسوساتی نظام کا جامع ہے اور اس اعتبار سے اپنے تشخص کی تلاش میں تشنہ دل رہا جب معاشرے کے دوسرے طبقات کے مقابل اپنے حیثیت کے سوال پر غور کرتی ہے تو وہ ایک تہذیبی انفس کا سوال ہے جو ایک مجروح انا سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب قراۃ العین حیدر مہرو کو اس کی محفل میں یا دل نواز بیگم کے روبہ رو بیان کرتی ہیں تو اسے ایک شے کی حیثیت سے دیکھتی ہیں یہ دونوں حیثیتیں تہذیب کے باطنی poles ہیں جن کے درمیان تقدیر کی ہزار ہا شکلیں نظر آتی ہیں۔۔۔ مختصرا قراۃ العین حیدر نے ان کرداروں کے سفر میں نسلی عناصر اور تاریخی عناصر کی جہت کو شامل کر کے انہیں ایک نیم مابعد الطبیعاتی سوال بنادیا ہے۔"(۲۵)

مستنصر حسین تارڑ کے منطق الطیر جدید کا بنیادی موضوع بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینا ہے جس کے لیے تمام مذاہب کو وحدت الوجود کے مابعد الطبیعاتی، سماجی، اخلاقی اور ثقافتی بنیادوں کو اپنانے کی

ضرورت ہے۔اس کے لیے ناول میں بدھ ازم،ہندو ازم،سکھ ازم اور اسلام کے مابین وحدت الوجود کے حوالے سے تعلق جوڑا گیا ہے۔اس مقصد کے لیے پاکستانی معاشرے کے موسی حسین کے خواب میں کرشن،رام،بدھ،نانک،منصور،قراۃ العین طاہرہ،عرب علاقوں میں تسلیم کیے جانے والے پیغمبروں کی کایاکلپ پرندوں کی صورت میں دکھا کر برصغیر کے باشندوں کو تمام معاملات امن و سکون،دردمندی اور محبت سے طے کرنے کا درس دیا گیا ہے۔منطق الطیر قدیم کے برعکس ،منطق الطیر جدید کے پرندے ٹلہ جوگیاں اور اس کے اردگرد کے تاریخی،فطری،انسانی اور اخلاقی ماحول کی تصویر کشی کرتے ہیں۔دیگر تخلیق کاروں کی طرح خالدہ حسین بھی انسان اور اس کی زندگی کی ماہیت کو ادب کا حصہ بناتی ہے ان کے ناول "کاغذی گھاٹ" میں اگرچہ نسوانی کرداروں کا عمل دخل زیادہ ہے لیکن وہ وجود اور تقدیر جیسے سوالوں کے لیے صنفیت کے حدود سے اوپر اٹھ کر پورے انسانی صورت حال میں حقائق کو دیکھتی ہیں۔مشرقی پاکستان کے المیے پر مبنی محمد حمید شاہد کا ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" کرداروں کے حالات،مسائل اور تقدیر کے پیچ پر مبنی ہے۔ناول میں جہاں ماضی،حال اور مستقبل کے ادوار ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں ان میں تقدیر کی کارفرمائیاں بھی شامل ہیں جو کہ رشتوں اور دلوں کو بھی کاٹتی چلی جاتی ہیں۔عاصم بٹ کے "بھید" کے مطابق انسان کا المیہ ہی یہی ہے کہ اس کی زندگی سکرپٹڈ ہے۔اس کا کردار،اس کا انجام سب کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن پھر بھی وہ اسے اپنی خواہش کے مطابق بدلنے سے دست بردار نہیں ہوتا۔اسی وجہ سے تو "بھید" کے کردار وجودیت کے معیشت کی زد میں اپنے عمل اور رد عمل کی چکی میں چکر بھی کاٹ رہے ہیں اور پس بھی رہے ہیں۔اسی تگ و دو کو زندگی کا بھید کہا گیا ہے۔عرفان احمد عرفی کے مطابق:

> "وجودیوں بھی ایک ایسی لایعنیت کا مظاہر ہے جسے ہستی معنویت دینے درپے ہے اور یہ ہی تگ و دو نظام زندگی کو مختلف رستوں پر گامزن کیے ہوئے ہے۔یوں بھی سچ تو یہ ہے کہ ہم سب گم شدہ مسودوں کے کردار ہیں اور اپنے انجام سے جو لکھا جا چکا ہے بے خبر ہیں گو اس کے تابع ہیں ۔۔۔ اور کبھی اسے اپنے مطابق بدلنے کی خواہش سے دست بردار نہیں ہوں گے۔"(۲۶)

جب کہ ڈاکٹر امجد طفیل کے مطابق:

> ""دائرہ" فکری اور فلسفیانہ سطح پر ایک ایسے سفر کی علامت بنتا ہے جس میں مسافر پلٹ کر اسی جگہ آجاتا ہے جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔حالات کی جبریت نہ

صرف "دائرہ کے کرداروں کے گرد شکنجہ کستی دکھائی دیتی ہے بل کہ اس سے بھی آگے "ناتمام" اور "بھید" تک اس کے سائے گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔"(۲۷)

"حسن منظر کے ناول "العاصفہ"، "بیر شیبا کی ایک لڑکی" اور "ماں بیٹی" عورت کے حالات اور اس کی تقدیر کو موضوع بناتے ہیں ان ناولوں کے نسوانی کردار سماجی، تہذیبی اور مذہبی پس منظر کے باوجود یکساں تقدیر کے سامنے بے بس ہیں۔ نجمہ سہیل "اندھیرا ہونے سے پہلے" بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے والے کرداروں کو موضوع بناتی ہے۔ناول میں فلیش بیک کی تکنیک کی مدد سے کرداروں کے ماضی نمائی کے ساتھ حال کا سفر بھی جاری رہتا ہے۔ماضی کی غلطیوں کی تصحیح وقت کی بے رحمی کے باعث ممکن نہیں ہو پاتی۔فنا کے خوف کے ہاتھوں لوگ ایک دوسرے کی قریب آرہے ہیں لیکن بقا کی کوئی صورت نہیں۔ایسے میں تصوف اور صوفی کا وجود بے معنویت میں رنگ بھرتا ہے۔فنا کے بعد زندگی پھر سے نیا سفر شروع کرتی ہے۔گلزار کا ناول "دو لوگ" ۱۹۴۷ کی تقسیم سے لے کر ۱۹۸۴ء تک سکھوں کے خلاف فسادات اور انگلستان میں برصغیر کے مختلف کونوں سے آباد ہونے والوں کے حوالوں سے جدید انسان کے تقدیر پر سوال اٹھاتا ہے جو کہ پیدا کسی ملک میں ہوتے ہیں پلتے کسی اور ملک میں، شادی اور ملازمت کسی تیسرے ملک میں کرتے ہیں جب کہ مرتے کسی چوتھے ملک میں یا پھر واپسی کے لیے آبائی وطن کا رخ کر لیتے ہیں۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان "امراؤ جان ادا" اور ناول "ایک چادر میلی سی" کا ذکر بھی تقدیر کے جبر کے حوالے سے کرتے ہیں۔روسی ناولوں "CANCER WARD"، "DR ZHIVASGO" اور انیس ناگی کے ناولوں "دیوار کے پیچھے"، "میں اور وہ" اور ناول "کیمپ" کا ذکر بیرونی جبر کے حوالے سے کیا گیا ہے۔انیس ناگی کے ناول کے ہیرو پروفیسر کے مطابق یہ کائناتی نظام میرے خاتمے پر تلا ہے۔

معاشرت / سماج:

انتظار حسین کا یہ ناول "بستی" پنڈت، بھگت جی، حکیم بندے علی، منشی مصیب حسین، ذاکر اور ذاکر کے باپ جیسے کرداروں کے ذریعے اس دور کے رہن سہن، رسم و رواج، قدامت، وبا، علاج، روشن خیالی غرض اس سماج کا نقشہ کھینچ کر تقسیم، فسادات، ہجرت، ۴۷، ۵۸، ۶۵ اور ۷۱ کے آشوب در آشوب صورت حال کو موضوع بناتا ہے۔ڈاکٹر محمد افضال بٹ کے مطابق انتظار حسین کے ناولوں میں ہجرت کر کے آنے والے کرداروں کی ماضی پرستی کا شکار ہونے کی وجہ بھی یہاں کے سماجی و معاشرتی مسائل ہی ہیں۔نوشین صفدر کے مطابق ناول "بستی" ہجرت، تقسیم، بنگلہ دیش اور ۱۹۷۱ کے سانحات کے بیان میں پاکستان کے سیاسی و

سماجی حالات کی وضاحت کرتا ہے۔ مضمون کے مطابق ناول ہجرت کے بعد کے مہاجروں کے مسائل اور بنگلہ دیش کے قیام کے وقت پاکستانی عوام کی بے چینی، کرب، دہشت، نوجوان نسل کی بے راہ روی اور ماضی کی یادوں کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ تکلیف کا سامنا مہاجروں کو ہند و پاک کی جنگ کے موقع پر کرنا پڑا۔ جب وہ مشکوک نظر سے دیکھے جانے لگے ایسے میں اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے ہر جگہ میرا پاکستان، میرا پاکستان چلاتے ہوئے نہ تھکتے۔ ناول کے مطابق ہجرت صرف جگہ کی تبدیلی کا نام نہیں بل کہ اپنے مرکز سے دور ہونے سے بھی خوف اور وحشت انسان کو گھیر لیتے ہیں۔ مختصراً مقام اور معاشرے کی اجنبیت، متعلقہ افراد کو بے اطمینانی، عدم تحفظ اور خوف میں مبتلا رکھتی ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی اپنے مضمون میں ناول "نادار لوگ" کے بھٹہ مزدوروں سے متعلق باب کو زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کے مطابق "عبد اللہ حسین نے ناول کے اس پورے باب میں بھٹہ مزدوروں کی زندگی، ان کے پیشہ ورانہ خدوخال اور ان کی مخصوص معاشرت کی کامل آئینہ داری کی ہے"(۲۸) جب تک کسی معاشرے میں سماجی، قانونی ادارے انصاف کر کے ظلم و بربریت کرنے والوں کو نہیں پکڑتے تو ایسے معاشرے میں عبد اللہ حسین کے ناول "قید" کی رضیہ، مراد، علی محمد اور چوہدری اکرام جیسے کرداروں کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر افضال بٹ کے مطابق عبد اللہ حسین کے ناول سیاست، فوج اور سماجی ٹھکیداروں کو بخوبی عیاں کرتے ہیں۔ ناول "قید" کا بھی سماج اور سیاست سے گہرا تعلق ہے۔ "قید" کی رضیہ میر ایک ایسے سماج کو بے نقاب کرتی ہیں جہاں کے سارے حقوق مردوں کو حاصل ہیں۔ یوں ایسے سماج سے بغاوت کر کے وہ جان کی بازی لگا کر اپنا بدلہ لے لیتی ہے۔ سعید ساعی کے نزدیک "قید" ناول میں نام نہاد پیروں، فقیروں اور اس کی پشت پناہی کرنے والے سیاسی و فوجی قوتوں کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ منزہ مبین کے مطابق ناول "قید" قدامت پرستی اور جدت پسندی کو موضوع بناتا ہے جس میں قدامت پرستی کے ہاتھوں روشن خیالی کی جڑیں کاٹ دی جاتی ہیں۔ ناول میں رضیہ کا علامتی کردار روشن خیالی کا استعارہ ہے جس کی آواز کو قدامت پرستوں کے ہاتھوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کے مطابق ناول "قید" سماج میں پیری فقیری کے بڑھتے اثر ورسوخ کو موضوع بناتا ہے۔ ڈاکٹر محمد افضال بٹ کے مطابق "اداس نسلیں" نو آبادیاتی دور کے ہندوستان کے دیہاتوں اور شہروں کی بدلتی ہوئی سماجی صورت حال کو موضوع بناتا ہے۔ یہ ناول دکھاتا ہے کہ کس طرح آزادی کی تحریک میں عام لوگ مارے گئے۔ بچوں کو قتل، عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ ناول میں نیاز بیگ کسان، پرویز جاگیر دار، عذرا کا کردار طبقاتی بغاوت، نعیم کا بھائی علی مزدور طبقے کی

نمائندگی کرتا ہے جب کہ مدن اچھوت طبقے کی بقا کی جنگ لڑتا ہے۔ یہ ناول اس عہد کے ساتھ آج کے عہد کی کشمکش بھی بیان کرتا ہے۔ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان کے مطابق "عبد اللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" ہم عصر زندگی کے مختلف ادوار، ان میں سے گزرتے عمل اور صعوبت کے گرداب میں محصور افراد کی زندگیوں کے واقعات پر مشتمل ہے"۔[۲۹] ناول نگار نے معاشرتی، نظریاتی اور الجھی ہوئی سیاست پر مبنی صورت حال کو گرفت میں لایا ہے۔ یہ ناول دیہاتی زندگی، جاگیردارانہ نظام، نو آبادیاتی نظام، پہلی جنگ عظیم کے اثرات، ہندوستان کی سیاسی بیداری، ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی، تحریک خلافت، انگریزوں کا مراعات یافتہ طبقہ، مشترکہ ہندو، مسلم اور سکھ معاشرے کی حالت زار، فرقہ ورانہ فسادات، ہجرت، کارخانوں کی حالت ،مزدوروں کی حالت زار، مسائل، ہڑتالیں، حکومتی جبر، جیل کی فضا، اعلٰی طبقے کی بے نیازی اور عیاشیوں، طوائف کی زندگی، یورپی معاشرے کی جھلک، تہذیبی اقدار کی شکست وریخت اور پسماندہ طبقے کی بے بسی کو موضوع بناتا ہے۔ سعید ساعی کے مطابق "اداس نسلیں" کی کہانی متحدہ ہندوستان کی معاشرت پر مبنی ہے۔ شاہدہ دلاور شاہ اور پروفیسر عبد السلام بھی اسی تناظر میں ا"داس نسلیں"کا ذکر کرتے ہیں۔ منزہ مبین کے مطابق "اداس نسلیں" تقسیم سے پہلے کے حالات وواقعات جب کہ "نادار لوگ" تقسیم ہند کے بعد سماجی استحصالی قوتوں، جاگیردارانہ نظام، مارشل لاء اور مشرقی پاکستان کی صورت حال پر مبنی ہے۔ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان کے نزدیک ناول "باگھ" کا موضوع جبر ہے۔ انسان جس کا شکار معاشرے یا قسمت کی طرف سے ہوتا ہے۔ناول کا ہیرو شروع سے آخر تک اسی جبر کا شکار ہے جب کہ اس کی سانس کی بیماری اور یاسمین سے رابطہ اور پھر محبت میں مبتلا ہونا تقدیر کے جبر کا ہی نتیجہ ہے۔ منزہ مبین ،ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ اور سعید ساعی کے مضامین کے مطابق "باگھ" ناول میں علامتی واستعاراتی انداز میں ملک میں ہونے والی غیر جمہوری احوال کا بیان ملتا ہے جب کہ ناولٹ "رات"، "واپسی کا سفر" اور "نشیب" کے موضوعات بھی استحصالی طبقاتی معاشرہ ہے جس کے کردار اس نظام کے آگے ہار جاتے ہیں اور زندگی اپنی معنویت سے محروم ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر آصف فرخی "ناول اور ہمارے سماجی و تہذیبی رویے" کے عنوان سے ناول کے توسط سے معاشرتی رویوں کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ دیکھا جائے کہ

> "ناول کے تاروپود میں معاشرے اور تہذیب کے خدوخال کس طرح نمایاں ہوتے ہیں اور ناول اپنے صنفی تقاضوں کے تحت معاشرے کی حقیقت کس طرح گرفت میں لاتا ہے اور یہ حقیقت کس طرح گرفت سے نکل جاتی ہے"[۳۰]

چنانچہ اسی مضمون کے تحت پاکستانی سماج کے حوالے سے "گرگ شب"،"طوفان کی آہٹ"،"راستہ بند ہے"،"بارش سے پہلے"،"حبس"،"راکھ"،"اے غزال شب"،"صفر سے ایک تک"،" حسن کی صورت حال"،"مٹی آدم کھاتی ہے"،"دائرہ"،"نولکھی کوٹھی"،"میر واہ کی راتیں"،"مشک پوری کی ملکہ"،" قلعہ فراموشی"،" طاؤس فقط رنگ"،" جندر" اور" چار درویش اور ایک کچھوا" پر نظر ڈالتے ہیں۔ جب کہ ہندوستانی سماج کے حوالے سے "آخری سواریاں"، "دکھیارے"،"خواب سرائے"،"نعمت خانہ" اور "روحزن" کا ذکر کرتے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کے جائزے کے مطابق ناول "انیسواں ادھیائے" میں ۴۳،۲۷ سالہ نند کشور وکرم جدید زندگی کو جیسے دیکھتے ہیں محسوس کرتے ہیں اور جن حالات سے گزرتے ہیں، قاری کے سامنے رکھتے جاتے ہیں۔ ناول کا ہر باب الگ الگ کہانیوں کا حصہ معلوم ہوتے ہیں لیکن آخر میں مکمل سچ تک رسائی ہو جاتی ہے بالکل الگزنڈر سونسٹن کے ناول "کینسر وارڈ۔ گلاگ آرکیپالگو"۔ احمد صغیر کے ناول "جنگ جاری ہے" اور "دروازہ ابھی بند ہے" ٹوٹتے بنتے انسانی، اخلاقی اقدار اور آج کے مسائل بیان کرتے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں سامنے آنے والا نیلوفر کا ناول "آٹرم لین" ایجوکیشن مافیا سے متعلق ہے۔ ناول نگار نے الیگزنڈر سولینسٹین کے مشہور ناول "گلاگ آرکی پلاگو اور کینسر وارڈ" کی طرز پر اپنے ناول کی بساط سجائی ہے۔ ناول میں الگ الگ کمرے اور چہرے ہیں لیکن ناول کے مطابق لڑکی ہونے کا احساس کہیں بھی محفوظ نہیں ہونے دیتا حتیٰ کہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کے نام پر ایجوکیشن مافیا کا رویہ بھی یہی ہوتا ہے ایسی صورت میں پھر طلبا کے پاس خودکشی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ پروفیسر عبد اسلام اور نور الحسنین کے مضامین کے مطابق "میرے بھی صنم خانے" اودھ کی اس جاگیردارانہ نوجوان نسل کی عکاسی کرتا ہے جس نے انگریزی سامراجیت اور ہندوستانیوں کے ادھورے سیاسی شعور اور کٹر مذہب پسندی کو ملاحظہ کیا۔ صاف ستھرے ذہن و دل اور کردار کے مالک یہ نسل، ذات پات کی بجائے طبقاتی فرق کے تحت نئے نئے دولت مند ہونے والوں کی اس نئے انگلو انڈین کلچر میں داخلے کو ناپسندیدگی سے دیکھتے تھے۔ سماجی و معاشرتی موضوع پر مبنی ناول "نمک" کی کہانی ایک ہی خاندان کی تین نسلوں پر محیط ہے جس کا مرکزی کردار عورت ہے۔ "غم دل وحشت دل" میں مجاز کی شاعری وحیات کے حوالے سے مخصوص علاقے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ "مٹی کے حرم" جاگیردارانہ منظر نامے کا حامل ہے۔ ناول "بولو مت چپ رہو" آزادی کے بعد تعلیمی نظام کی تبدیلیوں اور اس شعبے سے وابستہ افراد کی عزتوں سے کھلواڑ اور نکسلی تحریک کے اسباب کو موضوع بناتا ہے سولہ ابواب پر مشتمل ناول "شوراب" معاشرے کے دیگر بہت سے تلخ حقائق کے ساتھ تلاش معاش کے سلسلے میں عرب

ممالک میں جانے والے ہندوستانی نوجوانوں کے مسائل اور نظام تعلیم پر قابض مافیا کے کرتوتوں کو بے نقاب کرتا ہے جسے ووٹ کے چکر میں حکومت جان بوجھ کر نظر انداز کرتی ہے۔"مانجھی" ناول مشترکہ ہندو مسلم کلچر کو موضوع بناتا ہے۔ناول"زندگی تیرے لیے" جنوبی مہاراشٹر کی معاشرت پر مبنی ہے۔"آہنکار" میں مادیت اور انسانی رشتوں کی ٹکراؤ کو موضوع بنایا گیا ہے۔"لیمینٹڈ گرل" ٹی وی کلچر کے نتیجے میں شہرت حاصل کرنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کی لگژری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔مذہبی شدت پسندی اور تنگ نظری کو نشانہ بناتا ناول "ایک ممنوعہ محبت کی کہانی" المیہ رومانی کہانی ہے جس کا آغاز اتفاقیہ جنسی تجربے کی بدولت ہوا۔ناول "ہم زاد جیتو جلاد" میں غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے پہاڑی علاقے کے باسیوں کی زندگی کا احاطہ کیا گیا جن کا کوئی پرسان حال نہیں لیکن پھر قیمتی معدنیات کی دریافت پر حکومتی اور عالمی دنیا کی نظر میں آجاتے ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد کے ناول نگاری کے ذیل میں یہ اظہار خیال ملتا ہے کہ ان کے ناول"مراۃ العروس"،"بنات النعش"،"توبتہ النصوح"،"ابن الوقت"،"فسانہ مبتلا" اور "رویائے صادقہ "اپنے عہد کے سماجی و معاشرتی مسائل اور زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔محمد فیصل کے مضمون "اردو ناول کا نگار خانہ: آغاز سے ۱۹۴۷ء تک" کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "بنات النعش" کی کہانی تھامس ڈے کے ناول The History of Sandford and Merton پر مبنی ہے جبکہ "توبتہ النصوح" کی کہانی The Family Instructer سے متاثر ہے۔مرزا ہادی رسوا کے ناول"امراؤ جان ادا"،"اختری بیگم"،"ذات شریف" اور "شریف زادہ" اپنے عہد کے لکھنؤ کے زوال یافتہ معاشرے کی تصاویر دکھاتے ہیں۔محمد فیصل کے مضمون کے میں ناول "امراؤ جان ادا" کو ڈیفو کے ناولوں Moll Flander اور Roxana سے مماثل قرار دیا گیا ہے خورشید ربانی کے مضمون کے مطابق "رسوا کا"امراؤ جان ادا" سرفراز حسین عزمی کے "شاہد رعنا" سے ماخوذ ہے۔ادبیات کے مضامین میں پریم چند کے ناولوں "اسرار معابد"،"گوشہ عافیت"،"چوگان ہستی"،"گودان" اور "میدان عمل" کی نشاندہی ہندوستانی سماج کے حوالے سے کی گئی ہے"گریز"ایک ہندوستانی آئی اے ایس نعیم کے انگلستان اور دیگر ممالک کے دورے کے دوران یورپ کی عیش کوشی اور لذت پرستی کی داستان ہے۔کشمیری پس منظر کا حامل ناول"شکست"عصری مسائل،سماجی بے چینی اور کرب کو بیان کرتا ہے۔قدرت اللہ شہاب "یاخدا" میں فسادات کو نئے انداز سے پیش کرنے کے ساتھ تقسیم کے بعد کے معاشرے کی تصویر پیش کرتے ہیں۔شوکت صدیقی کا"خدا کی بستی"۱۹۴۷ء کے بعد خدا کے نام پر بننے والے ملک کے جرائم پیشہ معاشرے کا عکس ہے۔عبداللہ حسین کا شعور کی رو پر مبنی ناول "اداس نسلیں" پہلی جنگ

عظیم سے لے کر تقسیم ہندوستان تک سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔" بانو قدسیہ کا "راجہ گدھ" رزق حرام کے اثرات، رزق حلال کی اہمیت کے ساتھ، ہوس، زر پرستی اور خود غرضی جیسے مسائل کو بیان کرتا ہے۔ سید محمد اشرف کا "نمبر دار کا نیلا" کو فرد اور سماج کا نوحہ قرار دیا گیا ہے یہ ناول انسان کی ہوس، خود غرضی، مکاری اور سفاکی کا بیانیہ ہے۔ نیلم فرزانہ کے مضمون کے مطابق بیسویں صدی میں خواتین کے ہاتھوں خواتین کے رسائل "تہذیب نسواں"، "خاتون" اور "عصمت" کے ذریعے سامنے آنے والے ناولوں نے اصلاحی رجحان کو پھیلانے کی کوشش کی۔ مضمون نگار رشید النسا بیگم، محمدی بیگم، مسز مولوی سراج الدین، اکبری بیگم، نذر سجاد حیدر، عباسی بیگم، صغرا ہمایوں، ا۔ ض۔ حسن بیگم، بیگم شاہنواز، ضیا بانو اور طیبہ بیگم کے ناولوں پر بحث کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ:

> "ان ابتدائی خواتین ناول نگاروں کے ناولوں میں ایک بڑی خصوصیت ماحول کی اور سماجی و تہذیبی زندگی کی پیشکش ہے۔ اس دور کے عام متوسط مسلم گھرانوں کی فضا، شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کی بہت ہی زندہ اور حقیقت پسندانہ تصویر ملتی ہے۔ اس طرح اکثر ناولوں میں اعلی خاندان مسلم گھرانوں کی تصویریں بھی ملتی ہیں جو نئی تعلیم اور مغربی تہذیب کے بہترین عناصر سے آراستہ تھے" [۳۱]

محمد فیصل کے یہاں بھی ابتدائی خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کو اسی تناظر میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ پروفیسر عبد السلام ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کے متعلق اپنے مضمون میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ "بقول عسکری صاحب یہ اردو کا پہلا اجتماعی ناول ہے۔ اس میں حیدر آباد دکن کی زندگی کی روح کھینچ کر آ گئی ہے جلال الدین احمد نے بھی اسی لیے اسے گالز دروی کے ساگا سے تشبیہہ دی ہے"۔ [۳۲] جب کہ "خون جگر ہونے تک "بنگال کے دیہاتی زندگی یعنی معاشی مسائل، تعلیمی و ذہنی کیفیت، سیاسی جدوجہد، قحط کی ہولناکی، اسلام کی افادیت، اشتراکیت کی مذمت جیسے نکات کو عمدگی سے بیان کرتا ہے۔ شہزاد منظر کے مطابق "آبلہ دل" کا موضوع لکھنؤ کا زوال پذیر جاگیر دارانہ معاشرہ ہے جبکہ "ترنگ" چوہان گڑھ نامی دیہات کے پس منظر میں نشے کے موضوع پر لکھا جانے والا ناول ہے جس میں ہرپال سنگھ کے نشے کی لت کی وجہ سے پورا خاندان تباہی کے دہانے پہ پہنچ جاتا ہے۔ ناول میں مرکزی اور ضمنی کرداروں کی مدد سے دیہاتی زندگی تمام تر جزیات کے ساتھ سامنے آجاتی ہے اور ناول سماجی دستاویز کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ناول "پریشر ککر" سماجی جبر کو برداشت نہ کر سکنے کے نتیجے میں ایک آرٹسٹ کے ذہنی توازن کھو دینے کی کہانی ہے۔ ڈاکٹر امجد طفیل کے مطابق "شاید

مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہمارا معاشرہ وہ پریشر ککر ہے جس میں کوئی سیفٹی وال نہیں"[۳۳] ناول "انخلا" اور "انقطا" ایوب خان کے دور سے ۱۹۷۷ء مارشل لاء کے عرصے تک کے پاکستانی معاشرے میں آنے والی سیاسی و سماجی تبدیلیوں کو موضوع بناتا ہے۔"ان ناولوں کا ایک اہم موضوع پاکستان میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینا اور اس سے پیدا ہونے والی انسانی صورت حال کا بیان بھی ہے۔"[۳۴] آفت کا ٹکڑا" قیام پاکستان کے بعد تہذیبی منظر نامے سے غائب ہونے والے اینگلو انڈین طبقے کی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ڈاکٹر امجد طفیل ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کے حوالے سے "ایک چادر میلی سی"،"ٹیڑھی لکیر"،"اندھے"،"خواب رو" اور "دو گز زمین" کا ذکر کرتے ہیں۔ مضامین میں شوکت صدیقی کے ناول "چار دیواری" کو لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کے حوالے سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ منشا یاد کا ناول "راہیں" دیہاتی زندگی کے سارے رنگوں کے ساتھ تقسیم ہند، فسادات، ظلم و ستم اور ہجرت کے نتیجے، معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کا تفصیلی بیانیہ ہے جب کہ ارشد وحید کا ناول "گمان" بنگلہ دیش کے مغربی پاکستان میں کمیونسٹ تحریک کے اتار چڑھاؤ، آمریت کے غیر فطری ادوار اور ان کے ذہنی، سماجی اور معاشرتی اثرات کا بیانیہ ہے۔

بلوچستان کے ادب کے حوالے سے محبت کے تڑکے پر مبنی فارس مغل کا ناول "سو سال وفا" بلوچستان کی حالیہ جنگی صورت حال کو موضوع بناتا ہے۔ کوئٹہ سمیت بلوچستان کے مختلف شہروں کے لوکیل پر مبنی اصلاحی اور رومانوی ناول "بندھن" میں ان علاقوں کے کردار چلتے پھرتے اور زندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ رفعت سراج کا ناول "رواج" پٹھانوں کے ایک رواج "ولور" کو موضوع بناتا ہے۔ ولور اس خاص رقم کو کہتے ہیں جو شادی کے موقع پر لڑکے کی طرف سے لڑکی والوں کو ملتی ہے۔ اس رقم کی عدم دستیابی کی وجہ سے لڑکے تادیر کنوارے اور لڑکیاں ماں باپ کے گھر بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ ناول نگار نے اس ناول میں ولور کے نام پر دو خاندانوں کی تباہی کے واقعے کو مؤثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ہاشم ندیم ناول "بچپن کا دسمبر" گھریلو زندگی اور بچپن کے حالات و واقعات کو بلوچستان کے مقامی عناصر کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔ "خدا اور محبت" میں ہاشم ندیم محبت کے علاوہ عالمی سیاسی اور معاشرتی منظر نامہ بھی دکھاتے ہیں فیصل ریحان کے مطابق "اس کا ہیرو جس طرح لندن میں "ہولو کاسٹ" پر بات کرتا ہے اور اسلام کی حقانیت ثابت کرتا ہے وہ نہ صرف بلوچستان کے اردو فکشن میں بلکہ مجموعی طور پر اردو میں ایک نئی چیز ہے۔"[۳۵] سیاسی، سماجی اور تاریخی تناظرات کا حامل خالد اقبال جوئیہ کا ناول "پڑاؤ" کی کہانی معدنیات کے ذخائر کی دریافت کی غرض سے لگائے گئے ایک کیمپ کے گرد گھومتی ہے جو کہ مقامی سرداروں کی ناپسندیدگی کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے۔ بلوچستان

کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی عکاسی کے حوالے سے آغا گل کے چار مختصر ناولوں "دشت وفا"، "بیلہ "، "بابو" اور "افسانہ جنات " کی نشاندہی کی گئی ہے۔ شاہ نواز علی کا "مجھے پاکستان سے جانا ہے "کا نسوانی کردار ان نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے جو کہ نوکری کی لالچ میں دوبئی جاتی ہے لیکن مزید پریشانیوں کا شکار ہو کر واپس آتی ہے تو پیچھے اس کا گھر بکھر چکا ہوتا ہے۔ حسن منظر کے ناول "العاصفہ "کا ذکر عرب معاشرت کی عمدہ عکاسی کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ اکرم ذوالقرنین اور مسیحی لڑکی میگی کی محبت کی کہانی پر مبنی الیاس محمد کے ناول میں زرینہ اپنے بیٹے کو غیر مسلم خاندان سے دور کرنے کے لیے مذہب کا سہارا لیتی ہیں۔ خالد طور کا ناول "بالوں کا گچھا" محبت کے ساتھ ہماری سماجی زندگی میں توہمات کے موضوع کو گرفت میں لیتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا ناول "پو کے مان کی دنیا" دکھاتا ہے کہ بچے کس طرح غیر ذمہ دارانہ دلچسپیوں کے ساتھ قتل و غارت گری، جوا، شراب، ریپ اور دوسرے جرائم میں ملوث ہو کر سماجی زندگی کو کہاں پہنچا رہے ہیں۔ "برف آشنا پرندے "کشمیر کے مسلم خاندان "اندھیرا پگ "راجھستان کے ہندو ٹھاکر خاندان کی روایتی اور سفاک زندگی جب کہ "کہانی کوئی سناؤ متاشا "اڑیسہ کے عیسائی خاندان کے ذکر پر مبنی ہے۔ حسن منظر کے ناولوں میں سے "دھنی بخش کے بیٹے" سندھ کی زندگی اس کے سماجی اخلاقی اور انسانی رویوں کو بیان کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ "ڈاکیا اور جولاہا" میں مقامی تہذیب و معاشرت کو موضوع بناتے ہیں۔ "ڈاکیا اور جولاہا" کے کردار اگر آج کے زمانے میں خاص اہمیت نہیں رکھتے تاہم ایک زمانے میں سماج پر گہرے اثرات مرتب کرتے تھے۔ اور

> "تارڑ نے ان دونوں کے ذریعے انسانی معاشرے کی غیر مادی جھلک اور انسانوں کے درمیان باہمی تفاعل اور تعلق کی دنیا روشن کو روشن کیا ہے جس کی اپنی ایک جاذبیت بھی ہے اور جو اپنی تمام تر سادگی کے باوجود گہرے انسانی تعلق، اور مستحکم بنیادوں پر قائم سماجی تجربے کی حامل محسوس ہوتی ہے۔"(۳۶)

اکرام اللہ ناول "سوا نیزے پر سورج" میں خاندانی اور سماجی مسائل کو موضوع بناتے ہیں جس کا نتیجہ عہد جدید میں انسانی ابتری کی صورت میں سامنے آتا ہے جب کہ ان کے دوسرے ناول "آواز کے سائے" بظاہر تو ایک جذباتی نوجوان اور طوائف کے درمیان محبت کی سادہ سی کہانی پر مبنی ہے لیکن یہ کہانی ہمیں ہمارے سماج، اس کے اخلاقی ضابطے، قانونی حالات، نظام کی بے بضاعتی اور بے حسی سے متعلق تکلیف دہ مسائل سے دوچار کرتی ہے۔ "گرگ شب" میں اکرام اللہ مذہبی منافرت کو موضوع بناتے ہیں۔ ساگا یا میگا

ایکسپریمنٹ کا حامل شمس الرحمان فاروقی کا ناول "کئی چاند تھے سر آسماں" بر صغیر کی اردو تہذیب، معاشرت اور تاریخ کے ایک وسیع زمانی دور، بڑے جغرافیائی حدود اربعہ اور کثیر ثقافتی سماج کو موضوع بناتا ہے۔ انیس ناگی کے یہاں بنے بنائے سماجی ڈھانچے توڑنے کا مزاج ملتا ہے ان کے ناول "ناراض عورتیں" کے نسوانی کرداروں کا ابتلا اور استحصال سے گزرنے کے بعد کارِ عمل سفاکی میں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے ناول کا مطالعہ عصمت چغتائی کی اس بات کی جانب متوجہ کرتا ہے کہ "مرد کی طرف سے عورت پر جو ظلم ہوئے ہیں، ان کے حساب کے بعد یہ بھی دیکھے جانے کی ضرورت ہے کہ خود عورت نے عورت پر کیسے اور کتنے ظلم کیے ہیں اور مرد پر بھی"[۳۷] "پتلیاں" سیاسی و سماجی جبریت کے شکار انسان کی بے بسی اور لاچاری کو پیش کرتا ہے۔ سماجی حقیقت کی روایت سے وابستہ شیخ محمد سعید اپنے ناولوں "ایک اور دریا" اور "نہ جنوں رہا" میں سماجی زندگی کی جھلکیوں سے متاثر کرتے ہیں۔ وسطی پنجاب کے لوکیل پر مبنی ناول "کوہ گراں" معاشرتی صورت حال خاص طور پر پانی کی کمیابی کو موضوع بناتا ہے۔ "زینہ" ناول پاکستانی معاشرے میں اقلیت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی عکاسی کرتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کا ناول "جندر" دکھاتا ہے کہ کس طرح ایک انسانی کردار اناج پیستے پیستے ایک مشینی کل کا حصہ بن کر باقی سب چیزیں بھول جاتا ہے۔ آزاد مہدی کے ناول "دلال" اور "اس مسافر خانے میں" پاکستان کے معاصر سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے کرداروں کے خواب سماجی تشدد خاص طور پر مذہب کے نام پر تشدد کے ہاتھوں چکناچور ہو جاتے ہیں۔ آمنہ مفتی ناول "پانی مر رہا ہے" میں پانی کے ذخائر میں تیزی سے ہونے والی کمی کو موضوع بناتی ہیں نیز یہ علامتی انداز میں ہمارے معاصر معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے بیان پر مبنی ہے۔ نجم الحسن کے ناول "ماروی اور مرجینا" کے متعلق ڈاکٹر امجد طفیل لکھتے ہیں کہ "ناول نگار نے اپنے ناول میں دنیا کی مختلف ثقافتوں کے آپس ربط سے بننے والی صورت حال میں انسانی زندگی اور معاشرت میں آنے والی تبدیلی کو گرفت میں لیا ہے"[۳۸]۔ محمد امین الدین کا ناول "کراچی والے" گزشتہ دو دہائیوں سے کراچی میں جاری آشوب کو موضوع بناتا ہے۔ فرانسیسی نژاد اردو ناول نگار ژولیاں "ساغر" میں مشہور شاعر ساغر صدیقی کی زندگی کو موضوع بناتی ہیں۔ صلاح الدین پرویز کا ناول "سارے دن کا تھکا ہارا پرش" عالمی تناظر میں جدید انسان کی بے بسی پر مبنی ہے تو "وار جرنلسٹ" اور "آئیڈنٹی کارڈ" سیاسی جبر و اقتدار کے ہوس میں انسانوں، معاشرتی رسوم اور عقائد کو استعمال کرتے مفاد پرست کرداروں کی عکاسی کرتے ہیں جب کہ ناول "ایک ہزار دو راتیں" داستانی سیاق میں علامتی آہنگ کے ساتھ ہندوستان کی معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ مشرف عالم

ذوقی کا "لے سانس بھی آہستہ "بھارت کے سیاسی، سماجی زندگی میں فرد کی بے بسی موضوع بناتا ہے۔ڈاکٹر شاہد نواز کے "اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں مقامیت کی دل آویز تشکیل" کے مطابق نو آبادیاتی دور میں جنم لینے ولا ناول مقامی رنگوں کی آمیزش سے محروم رہا اور یہ سلسلہ مختلف وجوہات کی بنا پر تقسیم کے بعد تک چلتا رہا لیکن ۱۹۸۰ء کے بعد آہستہ آہستہ مختلف ناول نگاروں کے ہاں مقامیت ابھرنا شروع ہوئی۔مقامیت کی یہ دل آویزی کرداروں، اسلوب یا جزئیات کی شکل میں سامنے آئی، کہیں کہیں موضوع کے طور پر بھی بھرتی گئی۔مختصراً "مقامیت کو پیش کرنے کا ایک ممکنہ شکل یہ ہے کہ سماج کے اندر رسوم ورواج، تقریباتی واقعات (Celebrative events) کو اجتماعی زندگی کا خوش کن چہرہ بنا کر پیش کریں "(۳۹)مضمون نگار مقامیت کے مختلف حوالوں سے مستنصر حسین تارڑ کے ناول "بہاؤ"، "خس وخاشاک زمانے" مرزا اطہر بیگ کے ناول "صفر سے ایک تک"، "حسن کی صورت حال" اور "غلام باغ" طاہرہ اقبال کے "نیلی بار "حسن منظر کے "دھنی بخش کے بیٹے" اختر رضا سلیمی کے "جندر" پر بحث کرتے ہیں۔محمد الیاس اپنے ناولوں "کہر"، "برف"، "پروا"، "دھوپ" اور "حبس" میں پولیس کے مظالم، جنرل ضیا کی پالیسیوں، بھٹو کی جاگیر دارانہ سوچ، جاگیر داروں کی آمرانہ سوچ اور مزارعوں پر ان کے مظالم کے ساتھ ساتھ نام نہاد پیروں کی بے عملی اور مسلمانوں کے ان پر اندھے اعتماد کے خلاف کھل کر احتجاج کرتے ہیں۔خالد محمد فتح ناول "سانپ سے زیادہ سیر اب" میں پاکستان کے ساٹھ سے ستر کی دہائی کے تہذیبی کشمکش کو موضوع بناتا ہے۔حسن منظر اپنے ناول "وبا" میں کراچی کے اسپتال اور اس سے جڑے کرداروں کی کہانیوں کے ذریعے طب کی صورت حال سامنے لاتے ہیں۔غلام ثقلین نقوی کا ناول "میرا گاؤں" ملک کی ترقی میں دیہات کے کردار، اس کے مسائل، لوگوں کے سوچنے کا انداز، رویوں، زمین دار اور کسان کی طبقاتی کشمکش کو اجاگر کرتا ہے۔امان اللہ محسن کے مضمون "نیا ناول نئے تجربات" کے مطابق ۱۹۷۰ء کے بعد سائنس و ٹیکنالوجی کے انسانی زندگی، رویوں، فلسفہ و فکر، اقدار، روایات، تہذیب و تمدن پر اثرات کو بانو قدسیہ، حجاب امتیاز علی، اختر رضا سلیمی اور پروفیسر طفیل ڈھابہ نے ناول کا موضوع بنایا ہے۔میڈیا اور جدید ذرائع ابلاغ کے جہاں بہت سارے فوائد ہیں وہاں لوگوں کے استحصال، روایات و اقدار کے خاتمے اور صارفیت کے کلچر کے پیچھے بھی اسی کا ہاتھ ہے۔میڈیا کے انسانی زندگی پر اثرات کے مختلف پہلوؤں کو مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ اور عاصم بٹ نے ناول کا موضوع بنایا۔۱۹۷۰ء کے بعد بڑے پیمانے پر دیہاتوں سے شہروں کی جانب ہجرت ہوئی۔خاص طور پر کراچی اور لاہور اس سے بری طرح متاثر ہوئے۔ان دونوں بڑے شہروں کو ناول کا موضوع بناتے ہوئے

بانو قدسیہ، امین الدین، عاصم بٹ اور فہمیدہ ریاض جدید زندگی کو بڑے شہروں میں درپیش مسائل اور ان کی معاشرت کا حقیقی آئینہ پیش کرتے ہیں۔ داخلی و خارجی کرب کا اظہار اگرچہ ناول کے لیے کوئی نیا موضوع نہیں تاہم ۱۹۷۰ء کے بعد پاکستانی معاشرے میں مذہبی انتہا پسندی، سیاسی ابتری، ضیاء الحق کی نام نہاد اسلام پسندی اور مارشل لاء نے انسانی زندگی کو حبس کا شکار بنا دیا۔ انور سجاد، عبداللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ، انور سن رائے اور اشرف ناشاد نے مقتدرہ کے جبر سے متعلق نئے نئے موضوعات اختراع کر کے ناول میں پیش کیے۔ مختار علی نیر کا ناولٹ "گلیاں اور بازار" تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے کردار کو موضوع بناتا ہے ڈاکٹر سید زبیر شاہ اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> "فکری سطح پر ناولٹ میں نہ صرف ہیجڑوں کے مخصوص ماحول کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے بلکہ ان کے عادات و اطوار اور طور طریقوں کو بھی حقیقی معنوں میں سامنے لایا گیا ہے مصنف کے مطابق چوں کہ ان لوگوں کے خونی رشتے اکثر ان کو خود سے جدا کر کے پرایا کر لیتے ہیں۔ اس لیے ہر مشکل میں یہ ایک دوسرے کا سہارا بن جاتے ہیں۔ ان کے اندر موجود عدم تحفظ اور بے بسی کا احساس ان کو آپس میں جوڑے رکھتا ہے۔"[۴۰]

نسیم انجم کا ناول "نرک" تیسری جنس کے شب و روز کی عکاسی پر مبنی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اگرچہ پیدائشی ہیجڑا نہیں ہوتا لیکن ہیجڑوں کے ہاتھوں اغوا ہونے کے بعد اسے مختلف مراحل سے گزار کر ہیجڑا بنا دیا جاتا ہے۔ یہ کردار خواہش کے باوجود بھی اس نرک سے نجات حاصل نہیں کر پاتا لیکن اپنی خواہش کی تکمیل ببر ملو کو رہائی دلا کر کر لیتا ہے۔ یہ ناول جہاں اس جنس کے شب و روز، مخصوص کلچر، رسومات، نفسیات سے آگاہی دیتا ہے وہیں ان کے متعلق معاشرتی رویوں کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ صادقہ نواب سحر کا ناول "رینو بہل" بھی تھرڈ جنڈر کو قریب سے سمجھنے کا موقع دیتا ہے۔

تہذیب:

پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین ناول "اداس نسلیں" کو تہذیبی زوال کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ناول اس "عصر بے چہرہ" کی پیداوار ہے کہ جب صدیوں کی شانت اور ٹھہری ہوئی ہندوستانی تہذیب اہل یورپ کے سیاسی چالوں معیشت اور تجارت کے فلسفوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وفات پا گئی۔ اسی تہذیبی زوال، اسی عصر بے چہرہ کو قراۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین اور خدیجہ مستور بھی موضوع بناتی ہے۔ اداس نسلیں کی کہانی مستقبل کے اندھیرے، حال کی غیر یقینی صورت حال اور ماضی کا آہستہ آہستہ گھپ

اندھیرے میں تحلیل ہونے پر مبنی ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق "ہم ایسی ہی قوم کی اداس نسل ہیں جن کی تاریخ ریاستی پالیسیوں کے تابع ہے اور حال اور مستقبل اسی "طے شدہ تاریخ" کے زیر اثر اپنا چہرہ واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"(۴۱) مشرف عالم ذوقی، محمد حمید شاہد، مبین مرزا، ڈاکٹر امجد طفیل، اور محمد فیصل، سید محمد اشرف کے ناول "آخری سواریاں" کو گنگا جمنا کے کنارے جمی جمائی تہذیب کے زوال طور پر دیکھتے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کے مطابق

> "سید محمد اشرف نے نہ صرف ہماری تہذیب کا نوحہ بیان کیا بلکہ، بہادر شاہ ظفر، شاہی دستر خوان، سلطنت مغلیہ کے عروج و زوال کی داستان کو نرم لہجے میں اس طرح بیان کیا کہ ہر صفحے پر صدیاں سمٹ آئیں اور سواریوں کا رخصت ہونا تہذیبوں کے تصادم اور زوال کی علامت بن گیا۔"(۴۲)

نور الحسنین کے مطابق جیلانی بانو کے ناول "ایوان غزل" اور "بارش سنگ" حیدر آباد کے معاشرتی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ ناول "ایوان غزل" میں احد حسین اور احمد حسین حیدر آباد کے زوال پذیر معاشرے کے نمائندے ہیں۔ ناول نگار نے عورتوں کے ہر دو طبقے یعنی با اختیار اور بے اختیار کے مسائل کو خوبی سے اجاگر کیا ہے جبکہ "بارش سنگ" تلنگانہ تحریک کے روشنی میں حیدر آباد کے معاشرتی شب و روز کے تصاویر دکھاتا ہے جہاں کسان اور مزدور بے زبان مخلوق کی طرح زمین داروں اور جاگیروں کے حکم کی پابند ہے جہاں عورتوں کا جسمانی استحصال روز کی بات ہے اور تلنگانہ تحریک اس نظام کے خلاف ایک احتجاج تھا۔ مشرف عالم ذوقی اور نور الحسنین کے مطابق یاور یعقوب ناول "دل بن" میں سندھ کی قدیم تہذیب کو قلم بند کرتے ہیں۔ ادبیات کے مضامین میں مستنصر حسین تارڑ کے ناول "بہاؤ" کو کہیں پہ تہذیبی زوال تو کہیں پر تہذیب کے ارتقا کی کہانی کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یہ ناول ۵ ہزار سال پہلے کی تہذیب، موہن جو دڑو کے زمانے کو کہ جب مادر سری معاشرہ قائم تھا کو کرداروں کی صورت میں مہارت سے پیش کرتا ہے یہ کردار انوکھے ہونے کے ساتھ اپنے اندر ایک مکمل علامت رکھتے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی ناول "کئی چاند تھے سر آسماں" میں ۱۸۱۱ء سے ۱۸۵۶ء تک کے تہذیبی تاریخ کو بنی ٹھنی، وسیم جعفر، محمد یوسف سادہ کار، انوری خانم عرف بڑی بیگم، عمدہ خانم عرف منجھلی بیگم، وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم، مولوی نظیر، نواب یوسف علی خان، مارسٹین بلیک، ولیم فریز، مرزا غالب، نواب شمس الدین، مرزا داغ دہلوی، تراب علی شاہ محمد آغا، ضیاء الدین، مرزا فتح الملک بہادر عرف مرزا فخرو، زینت محل اور دوسرے بہت سے کرداروں کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔ انیس

اشفاق ناول "دکھیارے" میں لکھنؤ کی بوسیدہ ہوتی تہذیب کو موضوع بناتے ہیں اور اپنے دوسرے ناول "خواب سرائے" میں بھی اسی ناول کے فضا کی توسیع کرتے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کا ناول "لے سانس بھی آہستہ" تہذیب، ارتقا، جنگ، تقسیم اور اخلاقیات کو سوال بناتا ہے۔ ترنم ریاض کا ناول "برف آشنا پرندے" کی کہانی ایک مسلم کشمیری خاندان کے تہذیبی زوال پر مبنی ہے۔ ثروت خان کا "اندھیرا پگ" راجھستانی سماج میں عورت کی کیفیت اور حیثیت پر مبنی ہے۔ صادقہ نواب سحر کے "کہانی کوئی سناؤ متاشا" کی کہانی اڑیسہ کے عیسائی فیملی کے متاشا کے گرد گھومتی ہے۔ تقسیم ہند سے قبل شروع ہونے اور ۱۱/۹ پر آ کر ختم ہونے والے مستنصر حسین تارڑ کے ناول "خس و خاشاک زمانے" کا موضوع تہذیبوں کا بدلتا ہوا منظر نامہ ہے۔ ناول دکھاتا ہے کہ کس طرح بدلتا ہوا تہذیبی، تاریخی اور جغرافیائی منظر نامہ انسانی مزاج اور رویوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرید حسینی اپنے مضمون میں اس ناول کو جمیس جوئس کے یولیسس سے مشابہہ قرار دیتے ہیں جب کہ ناول کے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> "تاریخ کے مابعد نو آبادیاتی نظریے کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول فرد اور سماج کی آدرشوں اور آرزوؤں کے کرچی ہونے کی کتھا ہے۔ فرقہ پرستی اور تعصب کے بجائے انسان دوستی اور محبت کے پہلو کو نمایاں کر کے تہذیب کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔"[۴۳]

ندیم سید کا ناول "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" ملتان کی تہذیب و ثقافت کو موضوع بناتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے ناول "مرگ انبوہ" میں مذہبی منافرت، انتہاپسندی، ذات پات کی جکڑبندیاں اور ریاستی دہشت گردی بھارتی تہذیب و ثقافت کے لیے موت کا اعلامیہ بن رہا ہے۔ "اے عشق بلاخیز" ہندوستان کے پنجابی اور بہاری تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے دو خاندانوں کی ہجرت کے بعد پاکستان میں بسنے کی کہانی ہے۔ اظہر حسین کے مطابق یہ ناول "خالد فتح محمد کی فکشن میں منفرد نوع کا اضافہ ہے۔ یہ اضافہ اپنے اندر تہذیبی بدلاؤ اور تہذیبی کایا کلپ سموئے ہوئے ہے"[۴۴] خالدہ حسین "کاغذی گھاٹ" میں ملک ٹوٹنے کے سانحے کو تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ امان اللہ محسن کے مضمون "نیا ناول: نئے تجربات" کے مطابق روایتی ناولوں میں اگرچہ قراۃ العین حیدر، احسن فاروقی، عزیز احمد، جیلانی بانو بر صغیر کی تہذیب و ثقافت کے مٹنے کا نوحہ لکھا ہے یا پھر تہذیب و ثقافت کی بازیافت یا جڑوں کی تلاش کی کوشش کی گئی۔ لیکن جدید ناولوں یعنی ۱۹۷۰ء کے بعد کے ناولوں میں مستنصر حسین تارڑ ناول "راکھ" اور "بہاؤ" اختر رضا

سلیمی "جاگے ہیں خواب میں" فہمیدہ ریاض "قلعہ فراموشی" میں تہذیب و ثقافت کے مٹنے کے نوحے کو حال اور مستقبل سے ملاتی ہیں۔

معیشت:

عبد اللہ حسین اپنے ناولوں میں سرمایہ دارانہ اخلاقیات کو موضوع بناتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ اخلاقیات میں انسان، انسانیت سے زیادہ سرمایے کی اہمیت ہوتی ہے۔ سرمایہ دار انسانیت کی بجائے اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ مظہر عباس کے مضمون کے مطابق عبد اللہ حسین "اداس نسلیں" میں نعیم کے بھائی علی کے ذریعے سرمایہ دارانہ اخلاقیات اور اس کے نتائج پیش کرتے ہیں جب کہ "نادار لوگ" میں ملک اعجاز، ملک جہانگیر اور مزدوروں کے ذریعے اس نظام کی بخوبی عکاسی کی گئی ہے۔ خورشید ربانی بھی "اداس نسلیں" کا ذکر معاشی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل کی عکاسی کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی کے مطابق بیسویں صدی کا ایک اہم مسئلہ بہتر تلاش روزگار کے لیے غریب ممالک کے محنت کشوں کا یورپی اور دیگر متمول خطوں کی جانب ہجرت کرنا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر صرف عبد اللہ حسین نے ناولٹ "واپسی کا سفر" کی صورت میں قلم اٹھایا ہے جو کہ برمنگھم میں ایک ہی کمرے میں غیر قانونی طور پر مقیم آٹھ پاکستانیوں اور ایک عورت کی کہانی پر مبنی ہے۔ عورت (جس کا نام میری ہے) کے اس کمرے کے تین مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات استوار ہو جاتے ہیں۔ مضمون نگار کے مطابق مصنف نے عورت کے سماجی مقام کو تلاش معاش کی غرض سے بیرون ملک مقیم مہاجروں کے ساتھ مماثل کیا ہے کہ عورت کی چال بھی مہاجر کے جیسے ہی ہے اسے جہاں سے رزق ملتا ہے یا جنسی تسکین ہوتی ہے اسی ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہے۔ شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" دکھاتا ہے کہ کس طرح خدا کے نام پر بنائے جانے والے ملک میں پیسہ مخصوص خاندانوں کی ملکیت بن گیا ہے۔ غربت، افلاس اور بے روزگاری کے ہاتھوں کس طرح نوجوان جرائم کی دلدل میں پھنس رہے ہیں۔ سرشار کا ناول "کایا پلٹ" سیاسی و معاشی حوالوں کو موضوع بناتا ہے۔ نجم الحسن رضوی کا "ماروی اور مرجینا" عہد جدید کے انسانی صورت حال اور کارپوریٹ معاشرے کو موضوع بناتا ہے جس کی شناخت کے دو بڑے عناصر معاشیات اور سیاسیات ہیں۔ ڈاکٹر امینہ بی بی کے مطابق سماجی و اقتصادی عدم مساوات کے پیدا کرنے میں ایک اہم ہاتھ ۱۱/۹ کے واقعے کا بھی ہے۔ اس واقعے کی بدولت پیدا شدہ صورت حال اور مسائل کا بیان "خس و خاشاک زمانے میں"، "طاؤس رنگ چمن"، "ساسا"، "قلعہ جنگی" اور نیلی بار" میں ملتا ہے۔ قیام پاکستان کے دوران کے فرقہ ورانہ فسادات، کشت و خون کے نتیجے میں پیدا شدہ معاشرتی اور

اقتصادی مسائل کی گونج اس صدی میں بھی سنائی دیتی ہے۔"کاغذی گھاٹ"اور "ادھ آدھورے لوگ" انہیں موضوعات پر مبنی ناول ہیں۔سماجی اور معاشی مسائل کے فروغ میں جاگیر دارانہ، سرمایہ دارانہ نظام اور طبقاتی تقسیم اور کمپیوٹر اور جدید ٹیکنالوجی کی تباہ کاریوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ان عناصر کی مدد سے پیدا شدہ مسائل کا بیان "کاغذی گھاٹ"، "نیلی بار"، "اے غزال شب"، "صفر سے ایک تک"، "غلام باغ" اور "زینہ" میں ملتا ہے۔اسی صارفیت،مادیت،سیاست یا جاگیر دارانہ اجارہ داری کی بدولت جدید انسان بے معنویت، لغویت اور لایعنیت کا شکار ہو کر شناخت کے بحران کے مسئلے سے دوچار ہوا ہے جس سے لوگوں میں لاتعلقی اور اجنبیت کے رویے پروان چڑھ رہے ہیں۔یہی المیہ عاصم بٹ کے "دائرہ" میں جبکہ "جندر" میں دوسرے زاویے سے ملتا ہے۔ عالم گیریت یا عالم کاری نے شخصی زندگی کی انفرادیت، مقامیت اور فردیت کی بجائے اجتماعیت، سماج اور اشیا کو اہمیت دی۔جس سے نہ صرف انسانی تنہائی میں اضافہ ہوا بلکہ مقامی، دیسی صنعتوں اور غریب ملکوں کی معیشت کو بھی شدید متاثر کیا۔جس سے غربت اور دیگر مسائل میں اضافہ ہوا۔۱۹۷۰ء کے بعد عالم گیریت کے نام پر جاری استحصال کو حسن منظر، انور سجاد، فہیم اعظمی، مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ، اشرف ناشاد اور نیلم بشیر نے ناول کا موضوع بنایا۔

سیاست:

ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان کے مطابق عبد اللہ حسین ناول "باگھ" میں پاکستان کے نظام اقتدار کے تضاد کو ابھارتے ہیں کہ ایک طرف تو کشمیریوں کی آزادی اور خود مختاری کے لیے کوشاں ہیں تو دوسری طرف اپنے شہریوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھ کر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ناول میں مصنف نے ماضی قریب اور حال کی سیاسی و معاشرتی زندگی کی مختلف صورتوں کو پیش کیا ہے جب کہ ناول "قید" کا بنیادی حوالہ سیاسی ہے۔ناول کی کہانی پاکستان میں مارشل کے دور پر مبنی ہے کہ جب صدر مملکت پیر پرستی میں مبتلا تھے تو اس کی دیکھا دیکھی سینئر افسران بھی اسی روش پر چل نکلے۔یوں اس ناول میں "مصنف نے ہنر مندی کے ساتھ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں آمریت کے شانہ بشانہ فروغ پانے والی سیاست کو تفصیلاً بیان کیا ہے "(۴۵) محمد شعیب خان کے مضمون کے مطابق قیام پاکستان سے لے کر مشرقی پاکستان کے سانحے تک کے دورانیے پر مبنی ناول "نادار لوگ" میں ملک کی سیاسی تاریخ کو عمدگی سے برتا گیا ہے اور اس سانحے کی وجوہات کو کرداروں کی مدد سے بے نقاب کیا گیا ہے۔منزہ مبین "اداس نسلیں" پر سیاسی حوالے سے سرسری نظر ڈالتی ہیں جب کہ محمد یونس اس پر تفصیلی بحث کرتے ہیں ان کے مطابق عبد اللہ حسین "اداس نسلیں"

کے ہیرو کے ذریعے سے ہندوستانی سیاست کے ساتھ بین الاقوامی سیاست کو بھی عمدگی سے ناول کا حصہ بناتے ہیں۔ یہ ناول جہاں ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ تک کے اہم واقعات پر مبنی ہے وہیں ناول میں فرضی کرداروں کے ساتھ حقیقی سیاست دانوں جیسے مسٹر گوکھلے اور تلک جیسے سیاست دانوں کا مزاج اور سیاسی سرگرمیاں بھی سامنے آئی ہیں۔ ناول میں اس دور کے سیاسی نظریات جیسے کہ تھیوسافی فلاسفی، سیاسی حالات کا بھرپور نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مقامی سیاست کے علاوہ بین الاقوامی سیاست جیسے کہ جنگ عظیم اول سے بھی مرکزی کردار کی مدد سے آگاہ کیا گیا ہے جو کہ آسٹریا کی شہزادی فرڈی ننڈ کے قتل کے سبب شروع ہوا تھا محمد یونس کے مطابق:

> "مرکزی کردار کی پرورش اس طرح کی گئی ہے کہ وہ مقامی سیاست سے نکل کر بین الاقوامی سیاست میں شامل ہو کر ہمیں جنگ عظیم کے حادثات کی خبر دیتا ہے۔ ہم اس کردار کے ذریعے تاریخ کے تمام اہم واقعات سے آگاہ ہوتے ہیں۔۔۔ سیاسی رہنماؤں کا ایک تحریک کو چھوڑ کر دوسری تحریک میں شامل ہونا ۔پھر تقسیم کے مراحل۔۔۔ مسلمانوں کا اجڑ کر پاکستان پہنچنا اور یہاں کی صورت حال کہ آزادی کے سفر میں لوگوں کی ذہنی کیفیات کیا ہوتی ہیں ان سب کو بیان کیا ہے اس طرح یہ ناول اپنا ایک مضبوط اور بھرپور سیاسی پس منظر رکھتا ہے۔"(۴۶)

اماؤس کی رات کے متعلق جس طرح رنگ رنگ کی بدعقیدگیاں اور بدگمانیاں پائی جاتی ہے اسی کا حوالہ استعمال کرتے ہوئے حسین الحق ناول "اماؤس کا خواب" میں قارئین کو ایسی آسیبی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں موت اور تاریکی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ غلام ہندوستان کے منظر نامے سے شروع ہونے والے ناول میں جہاں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں موت کی سیاست کا حوالہ ہے وہیں سقوط بنگلہ دیش کے ہندوستانی معاشرے پر اثرات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے نام منسوب اس ناول میں مصنف عالمی سیاست اور اس سے پیدا شدہ تہذیبی، سماجی، معاشرتی، معاشی بحران کو استعاراتی اور علامتی اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ صفدر زیدی ناول "بھاگ بھری" میں عالمی سیاست کے دو کمزور مہرے ہندوستان اور پاکستان کو موضوع بناتے ہیں۔ مذہبی انتہاپسندی جس طرح ۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کا باعث بنی ہوئی تھی آج بھی ہندوستان کے امن و سکون کے خاتمے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح پاکستان میں بھی ستر برسوں کے بعد انتشار کو سوا کرنے میں مذہبی انتہاپسندی سے کام لیا جاتا ہے جسے ضیاالحق کی پالیسیوں نے مزید بڑھاوا دیا ہے۔ اپنی اسی کمزوری کی بدولت یہ دونوں ممالک امریکی سامراجیت کے لیے آسان ہدف ثابت ہوئے۔ یوں تقسیم اور آزادی کے بعد کے

ہندوستان و پاکستان کے خون آلود منظر نامہ پر مبنی اس ناول میں ماضی اور مستقبل کے کولاژ سے عوامی بیداری کی کوشش کی گئی ہے۔ صغیر رحمانی کا پہلا ناول " تخم خون "" " اردو زبان کا پہلا ناول ہے جس میں دلت ڈسکورس اور نکسل مومنٹ کے ساتھ سماج اور معاشرے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور اسباب پر عصری ہیئت، عصری تقاضوں اور عصری حسیئت کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "(۴۷) یہ ناول ۱۹۹۰ء کے آندولنوں تحریک کے حوالے سے بتاتا ہے کہ بے شک صورتیں بدل گئی ہوں لیکن آج بھی سیاسی ظلم و جبر کا شکار غریب طبقہ ہی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ناول "خس و خاشاک زمانے "میں ہندوستان کی تقسیم، سقوط بنگلہ دیش، ایران، افغانستان اور عراق کے پس منظر میں صدیاں قید کرتے ہیں اور جس طرح سارتر کی کہانی کا کردار دیوار میں ایک سوراخ کے بہانے روشنی کا طلبگار ہے اسی طرح تارڑ کو آزاد اور غلام فضا میں اسی روشنی کی تلاش ہے۔ جاوید حسن کی پیدائش اگرچہ تقسیم کے بعد ہوئی لیکن جب بھی وہ آج کے ہندوستان اور فرقہ واریت کا ذکر کرتے ہیں تو سیدھا تقسیم کے المیے تک پہنچ جاتے ہیں۔ سیاسی منظر نامے کا حامل ناول "سیاہ کاریڈور میں ایلین "اعظم گڑھ سے لے کر بابری مسجد تک مسلم نوجوان کے خوف پر مبنی ہے۔ ناول دکھاتا ہے کہ کس طرح سیاہ کاریڈور میں چھپے ایلین کے ہاتھوں برپا فرقہ واریت کے کھیل کے ذریعے ہندوستان کے تقدس، بھائی چارے اور اتحاد کی دھجیاں بکھر رہی ہیں۔ اس ناول کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ۱۹۸۴ء اور اے نیمل فارم کا خالق جارج آر ویل، پریم چند، قراۃ العین حیدر اور شیکسپیئر بھی بطور کردار موجود ہیں۔ کرشن چندر کا ناول "جب کھیت جاگے "کا موضوع تلنگانہ تحریک جب کہ ناول "طوفان اور کلیاں "کشمیر کے ڈوگر شاہی حکومت کے ہاتھوں کشمیر کے غریب اور مظلوم مزدوروں اور کسانوں کے مظالم پر مبنی ہے۔ دستاویزی حیثیت کا حامل خواجہ احمد عباس کا ناول "انقلاب" کی کہانی جلیانوالہ باغ سے لیکر گاندھی- اردن معاہدہ ۱۹۲۹ء پر مبنی ہے۔ خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" جدوجہد آزادی کے نتیجے میں قربانیاں دینے والوں اور ہجرت کے بعد کی گمنامیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ جب کہ ناول "زمین" کو آنگن کی توسیع کہا گیا ہے۔ عامر سہیل ناول "آنگن" میں معاشی مسائل اور خاندان کے بکھراؤ کا سبب گھر کے سربراہ یعنی بڑے چچا کی سیاست میں دلچسپی کو ٹھہراتے ہیں جو کہ بیوی بچوں اور گھر بار کی ضروریات سے بے نیاز دوکان کی ساری آمدنی سیاست کی نظر کرتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی فکر تھی تو صرف ملک کی آزادی کی اور اسی میں وہ مطمئن تھے۔ عبد الصمد کا ناول "دو گز زمین" میں تقسیم کے بعد کے ہندوستانی مسلمانوں کے کرب اور بے بسی کو بیان کیا گیا ہے کہ ہجرت کرنے والوں کو نئی زمین قبول نہیں کرتی اور مہاجر کے لقب کا طنز سہنا پڑتا ہے جبکہ یہاں رہ

جانے والے مسلمانوں کو خواہ مخواہ مشکوک سمجھا جاتا ہے۔ علی امام نقوی کا ناول "بساط" کشمیر کے سیاسی حالات، معاشرتی مسائل اور فرقہ ورانہ تشدد کے موضوع پر مبنی ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا "پوکے مان کی دنیا" میڈیا اور سیاسی جماعتوں کی چالبازیوں پر مبنی ہے۔ شموئل احمد کا ناول "مہاباری" ریاست بہار کے سیاسی پارٹیوں کی خود غرضی کے ساتھ دفتر شاہی کی کوتاہیوں اور عوامی استحصال کو موضوع بناتا ہے۔ ڈاکٹر صغیر احمد نے گجرات فسادات اور بابری مسجد کی شہادتوں کے متعلق ناول "دروازہ ابھی بند ہے" لکھا ہے۔ سرشار کا ناول "کایا پلٹ" سیاسی و معاشی حوالوں کو موضوع بناتا ہے جب کہ "احمق الدین" انگریزی حکومت کی استحصالی پالیسیوں اور نسلی احساس برتری کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ کشن پرشاد کا ناول "شیاما" بیسویں صدی کے اوائل کی سیاسی، سماجی او اخلاقی سرگرمیوں کے عوام پر پڑنے والے اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ سیاسی شعور کے حوالے سے مرزا عباس حسین کے ناولوں "ربط ضبط"، "افسانہ نادر جہاں" اور المیمون کا ذکر ملتا ہے۔ محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی کے ناول "تمنائے دید" کی نشاندہی اپنے عہد کے سیاسی اور تعلیمی مزاج سے متعلق معلومات کی فراہمی کے حوالے سے کی گئی ہے۔ نثار عزیز بٹ کا ناول "نے چراغ نے گلے" جنگ آزادی، سائمن کمیشن، سول نافرمانی سے لے کر تقسیم کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول "تلاش بہاراں" کے متعلق پروفیسر عبد السلام یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> "اس کتاب کا نام بہت موزوں ہے۔ آزادی کے متوالوں نے اپنے تن من دھن کی بازی لگا کر آزادی کے جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر وہ فرقہ ورانہ فسادات تھے جو اعلان آزادی کے ساتھ ساتھ سارے ملک میں پھیل گئے۔ کیا اتنی قربانیوں کا ماحصل یہی بہاراں تھی جس کی تلاش میں پوری ایک صدی صرف ہو گئی۔"(۴۸)

فردوس انور قاضی کے ناول "خوابوں کی بستی" کا موضوع کراچی کی سیاست خاص طور پر لسانی سیاست ہے۔ جس طرح حالیہ دنوں میں ایم کیو ایم سے ایم کیو ایم پاکستان نمودار ہوئی بالکل اسی طرح ۱۹۹۰ء میں سامنے آنے والے اس ناول میں بھی ایک پارٹی کے بطن سے ریاست کے مفادات کی حامی دوسری پارٹی کو جنم لیتے ہوئے دکھا کر مستقبل کے سیاست کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ سیاسی، سماجی اور تاریخی تناظرات کا حامل خالد اقبال جوئیہ کا ناول "پڑاؤ" کی کہانی معدنیات کے ذخائر کی دریافت کی غرض سے لگائے گئے ایک کیمپ کے گرد گھومتی ہے جو کہ مقامی سرداروں کی ناپسندیدگی کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا ناول "مرگ انبوہ" آئینی ترامیم کے نتیجے میں مقبوضہ کشمیر اور پورے ہندوستان میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں

سے پیدا شدہ صورت حال پر منطبق ہوتا ہے۔ اقبال مجید کا ناول "کسی دن" عبد الصمد کا ناول "دھمک"، شموئل احمد کا "مہاماری" ہندوستان کے فسطائی صحافت کی عکاسی پر مبنی ہے۔ انیس ناگی کا ناول "پتلیاں" سیاست دانوں، اصلاح کاروں اور سماجی کرداروں کے کھوکھلے پن کو موضوع بناتا ہے جو کہ اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں ان کا اپنا کوئی مقصد حیات نہیں ہوتا دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بنتے ہیں۔ یونس جاوید "ستونت سنگھ کا کالا دن" میں انسان کے وحشی پن اور بہیمیت کو سیاست و اقتدار کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ ناول نگار اپنے زمانے کی سیاست اور اس کے زیر اثر کام کرنے والے اداروں کی غیر انسانی اپروچ کو بے نقاب کرتے ہوئے دکھاتا ہے کہ سیاسی عناصر کس طرح سماج کو یرغمال بنا کر لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سیاسی اثرات کا حامل ہندوستانی ناول "دی منسٹری اوف اٹموسٹ ہیپی نیس" کا ترجمہ ارجمند آرانے "بے پناہ شادمانی کی مملکت" کے عنوان سے کیا ہے۔ ہندوستان کی ایتھنک صورت حال سے عمومی، کشمیر کے مسئلے سے خصوصی تعلق رکھنے والا یہ ناول بیک وقت مذہبی، سیاسی، سماجی، اخلاقی اور انسانی نوعیت کے مسائل کو موضوع بناتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے مضمون کے مطابق ناول میں سیاسی رجحان کا غلبہ ہے۔ ناول میں ہالینڈ کے مشہور مصور پوش کے تینوں پینلز کی مدد سے ہمارے پر آشوب دور کو منعکس کیا گیا ہے۔ دراصل پوش کے ان تصاویر میں استعمال کیے گئے استعارے اور علامتیں "ایک عدم توازن کے شکار معاشرے میں جاری وساری ظلم و ستم، فرد اور مذہب کے استحصال، معاشرتی ناانصافیوں، جمہوری روایات کے قتل اور اعلی انسانی اقدار اور آدرشوں کے زوال کا نوحہ سناتے ہیں"[۴۹]۔ آمنہ مفتی کا ناول "آخری زمانہ" قریب کی سیاسی اور سماجی حقیقت نگاری کو موضوع بنائے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر وحید احمد کا ناول "زینو" سرمایہ درانہ نظام سے لے کر کمیونزم تک کے محاسن و معائب بخوبی بیان کرتا ہے۔ خالد اقبال یاسر اس ناول کے متعلق یوں لکھتے ہیں کہ:

> "وحید احمد کا یہ ناول خواص کا وہ طبقہ پسند کرے گا جسے ادب کی رنگینیوں، سیاست کی نیرنگیوں اور معیشت کی سنگینیوں سے دلچسپی ہے مگر اسے لکھا اس نے عوام کے لیے ہے جو سیاسی چالبازیوں اور اقتصادی چیرہ دستیوں کا اصل نشانہ ہیں"[۵۰]

ڈاکٹر تحسین بی بی کے مضمون کے مطابق ناول "کاغذی گھاٹ" میں تحریک پاکستان کے وقت کی سیاسی، سماجی و معاشی حالات، ذہنی گھٹن، قومی، تعلیمی مسائل، ہندو مسلم اختلافات، مہاتما گاندھی قتل، قائد اعظم کی شخصیت و کارنامے، سرحدوں کی تقسیم، مہاجرین کے مسائل، مارکسزم، ۱۹۶۵ء، اور ۱۹۷۱ کی جنگ کو

موضوع بنایا گیا ہے۔ حسن منظر ناول "حبس" میں فلسطین کے حوالے سے عرب دنیا بلکہ مسلم دنیا کے سیاسی ،مذہبی اور سماجی بیک ڈراپ کو ناول کا موضوع بناتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب تقسیم کے بعد فرقہ ورانہ فسادات کو "یاخدا" میں موضوع بناتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد لکھنے والوں میں سے ایک اہم نام قراۃ العین حیدر کا ہے جنھوں نے اپنے ناول "میرے بھی صنم خانے میں " ہندو مسلم فسادات کے پس منظر میں صوبہ متحدہ(یو۔پی) میں صدیوں سے آباد مسلمان گھرانوں کی معاشرت اور ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی شکست و ریخت کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی۔ان کے دوسرے ناول "سفینہ دل "کا موضوع بھی تحریک آزادی، تقسیم ،فسادات کے وقت کی صورت حال ہے۔برصغیر پاک و ہند کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کو حیات اللہ انصاری "لہو کے پھول "اور " گرتی دیواریں "میں موضوع بناتے ہیں۔انتظار حسین کا "چاند گہن" خدیجہ مستور کا " آنگن" بھی تقسیم کو موضوع بناتے ہیں۔ آغا سہیل کے ناول "غبار کوچہ جاناں" میں تقسیم کے بعد کے ہندوستانی مسلمان جاوید کو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد گرفتار کرکے واہگہ بارڈر پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

سقوط مشرقی پاکستان:

سقوط مشرقی پاکستان کے المیے کو موضوع بنانے والے ناولوں میں سلمی اعوان کا "تنہا"،رضیہ فصیح احمد کا "صدیوں کی زنجیر "الطاف فاطمہ کا "چلتا مسافر "کرنل روؤف ظفر کا "ماتم شہر آرزو" طارق محمود کا "اللہ میگھ دے " ظفر پیامی کا ناول "فرار " خالد محمد فتح کا "خلیج "حمید شاہد کا "مٹی آدم کھاتی ہے "شامل ہے۔

نائن الیون:

ناول جہاں زندگی اور سماج کی عکاسی عمدگی سے کرتا ہے وہاں عصری مسائل اور سانحات کو بھی موضوع بناتا ہے نائن الیون کا سانحہ بھی ایسا ہی سانحہ ہے جس نے اسلامی دنیا پر گہرے نقوش چھوڑے۔ دہشت گردی،شدت پسندی،بنیاد پرستی جیسے تاثرات کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑا جانے جانے لگا۔اس صورت حال نے مسلم دنیا اور خاص طور پر مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کے لیے بحران کی صورت اختیار کی۔اس صورت حال سے پیدا شدہ مسائل کی نمائندگی دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ ناول نے بھی کی۔ڈاکٹر محمد اشرف کمال نائن الیون کے موضوع پر مبنی ایسے ہی ناولوں کو شامل مضمون کرتے ہیں۔اس حوالے سے ان کے مضمون میں محسن حامد کے ناول "The reluctant Fundamentalist"، جان

اپڈیک (John updike) کے "Terrorist"، نعیم بیگ کے "کوگن پلین" (Kogan Plan) ۲۰۱۴ء، مرزا اطہر بیگ کے "صفر سے ایک تک" اکرام بریلوی کے "حسرت تعمیر" (۲۰۰۶ء)، مستنصر حسین تارڑ کے "قلعہ جنگی" (۲۰۰۳ء)، فہمیدہ ریاض کے "گوداوری" بھارتی ناول نگار شفق کے ناول "بادل" (۲۰۰۳ء) اور "کابوس" (۲۰۰۵ء)، پروفیسر خیال آفاقی کے "غلام روحیں" مشرف عالم ذوقی کے "آتش رفتہ کے سراغ"، سلمان عبدالصمد کے "لفظوں کا لہو" (۲۰۱۶ء)، اشرف ناشاد کے "صدر محترم" ۲۰۰۶ء، سلیم شہزاد کے "ویر گاتھا (۲۰۰۳ء)، یعقوب یاور کے "جہاد" (۲۰۰۹)، اچاریہ شوکت خلیل کے "اگر تم لوٹ آتے" (۲۰۰۳ء) اور احمد صغیر کے ناول "جنگ جاری ہے" اور "دروازہ بند ہے" کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ فیصل ریحان کے مضمون "بلوچستان میں اردو ناول کی روایت" کے مطابق ناول "مقدس" نائن الیون کے تناظر میں نیویارک کے مسلمان طلبا کے مسائل پر مبنی ہے۔ انیس ناگی کے ناول "۳۱۳ بریگیڈ" بھی نائن الیون کے بعد کے سماج کو موضوع بناتا ہے۔ نجم الحسن رضوی کا ناول "مٹی کا درخت" عمومیت کے ساتھ پاکستانی معاشرے خصوصیت کے ساتھ کراچی کے سماجی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی زندگی کو موضوع بناتا ہے۔ جدید مسائل میں سے خیر اور انسانیت پر اعتبار کے فقدان کو اپنے کرداروں اور معاشرے میں ابھارتے ہیں۔ یونس جاوید "کنجری کا پل" میں طوائف کی زندگی کے ظاہر و باطن کے ذریعے سماج کی تہوں کو الٹا پلٹا کر یہ دکھاتے ہیں کہ انسان تعلیمی اور تمدنی طور پر جتنی بھی ترقی کر لے لیکن اس کے اندر خود غرضی، سفاکی اور شر کا مادہ کم نہیں ہوتا اور جب بروئے کار لایا جاتا ہے تو تمام سماجی، تہذیبی اور مذہبی اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ پیغام آفاقی کا ناول "پلیتہ" کے خالد سہیل کا کردار محسن حامد کے ناول "The Reluctant Fundamentalist" کے چنگیز سے بالکل الگ نہیں۔ کردار کے ذکر سے محسن حامد کے ناول کے موضوع کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ناول مذہب، دہشت گردی اور بنیاد پرستی کے حوالے سے ایسے امریکہ کو متعارف کراتا ہے جہاں خوف اور ڈپریشن کی فضا ہے اور چنگیز جیسے ہر نوجوان کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے۔ جبکہ "پلیتہ" میں خالد سہیل کے موت کے نتیجے میں شروع ہونے والے انکوائری کے بہانے انڈے مان کے جزیرے اور کالا پانی کی سیر کرائی جاتی ہے۔ یوں چھوٹے سے گلوبل گاؤں میں تبدیل شدہ دنیا آج بھی شر، فساد اور جنگوں کی بھوکی ہے۔ عبدالصمد کا ناول "جہاں تیرا ہے یا میرا" میں ہندوستان، امریکہ، نائن الیون کا سانحے کے بعد کی خوفزدہ دنیا بھی ہے۔ یہ ناول عالمی سیاست سے متعلق طرح طرح کے سوالات اٹھاتا ہے ہندوستان کا مسلم اقلیتی رکن ارشد اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے خوابوں کی سرزمین امریکہ کا رخ کرتا

ہے لیکن تین سال قیام کے دوران وہاں کے حالات وواقعات کی بناپر اس انکشاف کے ساتھ واپسی کرتا ہے کہ امریکہ نے اپنے خوف کی وجہ سے پوری دنیا میں خوف برپا کر رکھا ہے۔شیر از دستی کا ناول "ساسا" جنگ اور دہشت کے موسم میں بے ریا محبت کی کہانی ہے۔ناول میں مشرق اور مغرب کے درمیان بے گانگی، نفرت اور تہذیبی تصادم کو نائن الیون کا واقعہ سوا کرتا ہے۔ناول ساسا پرندے کے وسیلے سے دو تہذیبوں کے مختلف ہو جانے والے ان حسیاتی اور فکری منطقوں کو نشان زد کرتا ہے جو نائن الیون کے پس منظر میں مزید نمایاں ہو جاتے ہیں۔

دہشت گردی:

مشرف عالم ذوقی کا ناول "آتش رفتہ کے سراغ" کا پہلا حصہ ۲۰۰۸ء کے واقعات، دوسرا حصہ ۲۰۱۰ء تک کے واقعات تیسرا حصہ ۲۰۱۰ء کے بعد کے واقعات پر مبنی ہے ناول کے مطابق لباس، ٹوپی، داڑھی، مذہبی رسومات اور ناموں کی بدولت اپنے ہی ملک میں مسلمانوں پر دہشت گردی کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔زیف سید کا ناول "گل مینہ" جہاد افغانستان اور دہشت گردی کے موضوع پر مبنی ہے ناول میں حسن بن صباح، حسن شاہ ابدالی اور طالبان کو بھی کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے۔

آدرش پسندانہ رویہ:

ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے مضمون کے مطابق آدرش پسندانہ رویے جیسے مسئلے کو اب تک زیر بحث نہیں لایا گیا جس کے باعث اکثر کردار نقصان اٹھاتے ہیں۔اسی حوالے سے ڈاکٹر صاحب "نگری نگری پھرا مسافر" کی ہیروئن افگار ناول "آنگن" کی ہیروئن عالیہ کا اور انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے" کا ذکر کرتے ہیں۔

نفسیات:

اسلوب احمد انصاری ناول "اداس نسلیں" کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> "ایک معنی میں ناول کا موضوع نعیم کی انا کا سفر ہے۔اس سفر کے دوران مختلف مرحلوں پر شکست وریخت، تحلیل اور شیر ازہ بندی کا جو عمل سامنے آتا ہے، یادوں کے جو ریلے تحت شعوری سطح پر گزرتے ہیں، اس کے توازن کو درہم برہم کرنے کے جو عوامل اور حوادث ذمے دار ہوتے ہیں۔خدا اور مذہب کے بارے میں تصورات کی مختلف جہتوں سے جس طرح آشنا ہوتا ہے، اپنی اندرونی وحدت و سالمیت کو برقرار رکھنے کی جو پیہم

کوششیں نعیم کرتا رہتا ہے، اور اسے ضمیر کی خلش کی جس جاں گسل آگ سے گزرنا پڑتا ہے، یہ سب عناصر اس ناول میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔"(۵۱)

مضمون میں اسی تناظر سے ناول پر بحث کی گئی ہے۔ اسلوب احمد انصاری مضمون میں کچھ مماثلتوں کا ذکر کرتے ہیں ان کے مطابق ناول میں وقت گزرنے کا احساس یاد آوری کی صورت اور تخیل کی صورت میں ملتا ہے۔ تخیل / فینٹسی کا استعمال اس وقت ملتا ہے کہ جب مچھیرا اپنا خواب بیان کرتا ہے جس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں زندگی کا استعارہ ہیں اور ان کا جال میں پھنسنا رنگینی و رعنائی سے محروم ہونے کو، موت کو زندگی کے تعاقب کے طور پر لیا گیا ہے۔ جس سے شیکسپیئر کے مشہور تاریخی ڈرامے King Richard-III کے کردار Clarence کی کہی ہوئی سطور کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ کلیرنس کے ان سطور کو بھی مضمون میں شامل کیا گیا ہے نیز اس قسم کی جھلکیاں شیکسپیئر کے آخری دور کے ڈراموں خاص طور پر The Tempest میں ملتی ہیں۔ مذہب کا پیش کردہ فلسفہ جس تک نعیم اپنے گوں ناگوں تجربات اور جذبات کی وساطت تک پہنچا ہے کو prophecy کا نام دیا گیا ہے "جو انگریزی شاعر ولیم بلیک کے ہاں ہر طرح کے وجدانی احساسات اور دروں بینی اور پیش بینی کے ہم معنی ہے اور مذہب کے خالصتاً روایتی اور اداراتی اساس سے کہیں بڑھ کر قابل احترام اور قابل وقعت ہے"(۵۲)۔ مضمون نگار کے مطابق ناول نگار تجربات کے ابلاغ و ترسیل کے لیے لمسیاتی محاکات سے کام لیتے ہیں۔ یہ عنصر نعیم اور شیلا کے جنسی تعلق کے درمیان بھی نمایاں ہے۔ خالص حسی طریقے سے پیش کیے گئے بعض مواقع، صورت حال، ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کرداروں کے اندرونی محرکات کا پتہ دیتے ہیں اور یہی طریقہ کار ڈی ایچ لارنس کے ناولوں میں بھی برتا گیا ہے حتی کہ مناظر فطرت کا بیان بھی اس تناظر میں کیا ہے کہ یہ بھی ایک Massive Force کا درجہ رکھتے ہیں جو کہ حواس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ "اداس نسلیں" کو وقت کے پھیلاؤ، وسعت، تنوع اور کثیر العناصری کے حوالے سے Chronicle ناول کہا گیا ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر گالزوردی کے ناول The Foryste Saga اور ڈی ایچ لارنس کے ناول The Rainbow کا ذکر کیا گیا ہے۔ "دونوں میں ہم دوران کی مختلف حد بندیوں اور کئی نسلوں کے نمائندوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں تاریخ کا تسلسل اتنا اہم نہیں جتنا ان نسلوں کے ذہن و قلب کی مختلف کیفیتوں کی مصوری۔ جو تاریخ کے راکب بھی ہیں اور مرکب بھی"(۵۳)

ڈاکٹر سعادت سعید، عبد اللہ حسین کے ناولوں کو ان کے سوانح کی روشنی میں پرکھنے کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ زیادہ تر خالق اپنے نفسیاتی احوال، سماجی مرتبے اور اپنے آئیڈیلز کو اپنے تحریروں کا حصہ بنانے سے

گریز نہیں کرتے اور یہی چیز عبداللہ حسین کی تحریریں میں ملتی ہے عبداللہ حسین کی نفسیات سمجھنے کی وجہ سے ان کی تحریروں کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے جیسے کہ مظفر اقبال " کیپسول بائیو گرافی " کے عنوان سے عبداللہ حسین کے اداس نسلیں کی سوانحی تعبیر کرتے ہیں۔ڈاکٹر اقبال آفاقی کے مطابق اداس نسلیں کے نعیم کی شخصیت میں جبلی طور پر باپ کی طرف سے ملنے والی ضدی اور باغی طبیعت اور چچا کے زیر سایہ پرورش نے بیدار مغزی، اولعزمی اور سرمہری سے جو Paradox پیدا ہوا۔وہ پوری زندگی آویزش اور مزاحمت کی صورت میں اس کے ساتھ رہا۔یہ آویزش اور مزاحمت خارجی کے ساتھ ذاتی زندگی میں بھی چلتی رہتی یوں جیسے کہ وہ ساری زندگی میدان جنگ میں رہا ہو۔نعیم اپنی انا(self love) کے آگے دوسرے رشتوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے جس سے تنہائی اور اداسی کو اپنا مقدر ٹھہر الیا تھا ساتھ میں شیلا سے جنسی تعلق کا خلش الگ بے سکون رکھتا تھا جس کے وجہ سے نعیم پر فالج کا اٹیک ہو جاتا ہے اور طبی نفسیات کے مطابق نعیم جیسے کرداروں کو پھر ایسے ہی نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔ مختصراً اقبال آفاقی نعیم کو درپیش مصائب کی ذمہ داری اس کی اپنی خود پرستی کو ٹھہراتے ہیں۔ محمد فیصل کے مضمون کے مطابق شعور کی رو پر مبنی عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" دیگر بہت سے مسائل کے ساتھ کرداروں کے نفسیاتی مسائل کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ خالد محمود کے مطابق عبداللہ حسین کے ناولوں کا پہلا رجحان 'رومان' دوسرا 'سیاست' اور تیسرا رجحان 'جنس' ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں عورت کی جنسی نفسیات اور حشر سامانیوں کے ساتھ مرد کی جنسی تشنگی کو بھی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔اداس نسلیں کے کرداروں کا اگرچہ مرکز و محور جنس اور جنسی خواہشات کی تکمیل نہیں تاہم انہیں جیسے موقع ملتا ہے وہ اس کی تکمیل کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں ان میں جوان اور بوڑھے دیہاتی اور شہری امیر اور غریب پڑھے لکھے و غیر تعلیم یافتہ ہر دو قسم کے کردار شامل ہیں۔اس سلسلے میں رشتوں کے تقدس اور معاشرتی اقدار کو بھی خاطر میں نہیں لایا جاتا۔مقالہ نگار، فرائیڈ کے جنسی آسودگی کے تصور کی نشاندہی عذرا اور نعیم کے تعلق کے حوالے سے کرتے ہیں۔خالد محمود کے مطابق:

> "صرف اداس نسلیں ہی نہیں جنس کا اظہار ان کی تمام تخلیقات / ناولوں میں موجود ہے۔اداس نسلیں کے اٹھارہ سال بعد عبداللہ حسین نے ناول "باگھ" لکھا۔اس میں بھی جنسی جھلکیاں موجود ہیں۔۔۔اس کے بعد ناول "قید" ہے۔جس کی سیاسی جہت کے ساتھ ایک اہم جہت جنس ہے۔اس ناول کی اساس بھی ایک جنسی واقعے پر رکھی گئی

ہے۔ قید کے تمام کردار شدید گھٹن کا شکار ہیں۔۔۔اسی ناول کے دو اہم نسوانی کردار ہم جنس پرستی کا بھی شکار ہیں۔"(۵۴)

جب کہ ناول "رات" میں فرائیڈ کے اس تصور کو برتا گیا ہے کہ جنس کا گہرا اثر بچوں کے ذہن پر پڑتا ہے۔اس حوالے سے مقالہ نگار ناول میں سے دو کم سن بچوں کی مثال پیش کرتا ہے جن کو جنس اور جنسی عمل کا شعور نہیں لیکن پھر بھی تجسس ضرور ہے اور لڑکے کے کہنے پر لڑکی خود کو بے لباس کر دیتی ہے۔ مبین مرزا کے مطابق عبداللہ حسین کے تخلیقی پیراڈائم کا بنیادی مسئلہ یا سوال انسان کی ازلی ابدی تنہائی ہے۔اس کے تحریروں کے کرداروں کی تگ و دو کسی ہم نفس، ہم دم کو پانے اور تنہائی کے آشوب اور اضطراب سے نجات حاصل کرنے پر مبنی ہے۔اس مقصد کے لیے وہ کبھی ایک در سے دوسرے در کی جانب لپکتے ہیں لیکن یہ احساس کم ہوتا نظر نہیں آتا۔ناول "اداس نسلیں" میں تنہائی کی مختلف صورتوں کو ہندوستانی سماج کی بے بسی اور لاچاری کی صورت میں جب کہ حاکم اور محکوم کی نفسیات کے حوالے سے جبر استحصال، مغائرت اور عدم تحفظ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار اپنی تنہائی کا تدارک کے لیے وجودی سطح پر کوششیں کرتا ہے اور اس مقصد کے لیے شیلا اور عذرا کی بہن سے جسمانی تعلق قائم کرتا ہے۔اسی طرح علی اور عائشہ کے لیے بھی تنہائی اور لایعنیت کے جان لیوا احساس کی بدولت زندگی ایک اذیت کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ مضمون نگار کے مطابق:

"یہ ناول انسانی زندگی کے واقعات، تجربات اور احساسات کے ایک وسیع دائرے کو محیط ہے۔ تاہم ان سب کے پس منظر میں ہمیں جو بنیادی احساس کارفرما نظر آتا ہے وہ تنہائی ہے۔یہ تنہائی وجود سے لے کر روح تک پھیلی ہے۔افراد اور اجتماع دونوں اس کے ہاتھوں گھائل ہیں۔دونوں کو اس کی اذیت کا تجربہ تو بار بار ہوتا ہے لیکن اس سے نجات کا عمل جسم یا خارجی سطح سے آگے نہیں بڑھتا۔ نتیجہ یہ کہ تاریخ ہو یا سیاسیات، تہذیب ہو یا مذہب اور سماج ہو یا فرد ہر جگہ ہم تنہائی کے گہرے احساس کو انسانی زندگی کو مجروح اور مضمحل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔"اداس نسلیں "کے تناظر میں یہی مسئلہ بنیادی کردار ادا کرتا ہے"(۵۵)

ناول "باگھ" میں اسد کی آوارہ گردی اور مہم جوئی کے پیچھے تنہائی کا جاں گسل احساس ہی ہے جو اسے مسلسل گھمائے، بھٹکائے اور پھرائے رکھتی ہے، جب کہ یاسمین اپنی تنہائی کا مداوا اسد کی صورت میں کرنا

چاہتی ہے۔ناولٹ "قید" کے تمام کردار چاہے رضیہ سلطانہ ہو یا پیر کرامت علی یا مولوی احمد شاہ، سلامت علی، فیروز شاہ، چوہدری اکرام سب اپنی جگہ تنہائی کے اذیت کے شکار ہیں کوئی اپنے اختیار کے باوجود، تو کوئی سماج کے استحصالی صورتوں کے نتیجے میں اور یہی تنہائی کسی کو جنسی لذت کا راستہ دکھاتی ہے تو کسی کو جبر و استحصال کا۔ غرض ناول کا کوئی بھی کردار اپنے داخل میں آسودہ حال نہیں۔ مذہب سے زیادہ سیاست کے عمل دخل پر مبنی ناول "نادار لوگ" کے کرداروں کی بنیادی ابتلا بھی تنہائی ہے۔اس ناول میں بھی تنہائی کے پیدا کردہ گمبھیر مسائل کا احاطہ متنوع صورتوں میں ناول کے کرداروں اعجاز، سرفراز، نسرین، سکینہ اور کنیز کے یہاں ملتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق رحیم گل کا ناول "جنت کی تلاش" ایک Frigid عورت کا قصہ ہے۔ امان اللہ محسن کے مطابق اردو ناول میں جنسی نفسیات کے موضوع کا اضافہ عصمت چغتائی کی بدولت ہوا۔ نورالحسنین "ٹیڑھی لکیر" کو عصمت چغتائی کا سوانحی ناول قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام کے ساتھ محمد فیصل بھی "ٹیڑھی لکیر" کا نفسیاتی حوالے سے ذکر کرتے ہیں کہ ٹیڑھی لکیر میں نفسیاتی پہلوؤں کی پیشکش عمدگی سے کی گئی ہے۔ ایم خالد کے مضمون کے مطابق اس ناول میں عصمت چغتائی نے معاشرتی اور اقتصادی حالات کے اثرات کو شمن کی شخصیت پر اثرانداز ہونے کے حوالے سے دکھاتی ہیں کہ

> "انسانی نفسیات کا ٹیڑھا پن فطری نہیں سماجی ہوتا ہے۔اردو ناول کو یہ ادراک پہلی دفعہ عصمت چغتائی کے اسی ناول سے ملتا ہے۔ یہی وہ پہلا ناول ہے جہاں فرائیڈ اور مارکس ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"(۵۶)

اس مقصد کے لیے عصمت چغتائی 'شمن' کا کردار اور اس کے ٹیڑھ پن کے لیے پوری سماجی ماحول تخلیق کرکے اسی میں شمن کے کردار کو دیکھا بھی ہے اور دکھایا بھی۔ امان اللہ محسن کے ساتھ محمد فیصل بھی "علی پور کا ایلی" کا نفسیاتی حوالے سے ذکر کرتے ہیں کہ آپ بیتی کی تکنیک میں انسانی نفسیات کو ممتاز مفتی نے "علی پور کا ایلی" میں استعمال کیا جب کہ ڈاکٹر مظہر اقبال کے مطابق ناول "علی پور کا ایلی" کی دلچسپی کی ایک وجہ آپ بیتی کے عنصر کی شمولیت ہے۔ ایلی کے والد علی احمد کی بدولت انسانی نفسیات کے بہت سے پہلو سامنے آئے ہیں۔ محلہ مفتیاں کی عورتوں کی صورت میں یہ نفسیاتی پہلو بھی سامنے آئے ہیں کہ بسا اوقات شکایات کے روپ میں عورتیں کیسے اور کتنے التفات دل میں رکھتی ہیں۔ یہ ناول علی احمد، صفیہ، شمیم، ہاجرہ اور ایلی کی زندگی کی کج ادائیوں پر مبنی ہے جو ان کی شخصیات پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔ناول دکھاتا ہے کہ ہمارا ماحول بچوں خاص طور پر بڑھتے بچوں پر کتنا گہرا اور پیچیدہ اثر چھوڑتا ہے۔ناول ایلی کے کردار کی صورت میں دکھاتا ہے کہ یہ

حالات و واقعات کس طرح انسان کی زندگی میں آنے والے ادوار پر حاوی رہتے ہیں۔ امان اللہ محسن کے مطابق ۱۹۷۰ء سے پہلے نفسیاتی کردار نگاری کے نمونے زیادہ تر جنسی نفسیات کے حوالے سے ملتے ہیں لیکن ۱۹۷۰ء کے بعد انسانی نفسیات میں کارفرما لاشعور، اساطیر اور اجتماعی لاشعور کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی جس کی مدد سے کرداروں کے نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو بانو قدسیہ، عبداللہ حسین، انتظار حسین، عاصم بٹ، حسن منظر، اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق انور غالب کا ناول "ندی" شاعرانہ اسلوب کا حامل ہونے کے ساتھ علامتی انداز میں انسانی سائیکی کی کیفیات اجاگر کرتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے مطابق شموئل احمد ناول "ندی" میں ندی کی رعنائیوں، شوخیوں، سرمستی اور فطری بہاؤ کے ذریعے عورت کی تہہ دار معنویت اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو بیان کرتے ہیں۔ اس ناول میں مرد کا کردار اصول پسند اور بندھے ٹکے فارمولوں پر جینے کا خواہش مند ہے جب کہ عورت جتنا کھل کر جینا چاہتی ہے اتنی ہی بندھی ہوئی زندگی گزارتی ہے۔ مختصراً یہ ناول مرد اور عورت کے نفسیاتی پیچیدگیوں کو بیان کرتا ہے۔ انسانی نفسیات اور ہجرت پر مبنی جتیندر بلو کا ناول "وشواس گھات" کا پری میچور بچہ 'دیوکی' صارفی معاشرے کی علامت ہے۔ مضمون نگار کے نزدیک اس کہانی نے منٹو، اپندر ناتھ اشک اور ممتاز مفتی جیسے ادیبوں کی تحریروں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ عزیز احمد کے ناول "ہوس" اور "مرمر اور خون" جنسی موضوع پر مبنی ہے۔ کرشن چندر کا ناول "زرگاؤں کی رانی" نفسیاتی ناول ہے۔ جوگندر پال کے ناول "نادید" اور "خواب رو" انسان کے اندرونی کرب اور نفسیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ بصیرتوں سے مالا مال اندھوں کی یہ کہانی (نادید) اگرچہ سیاسی بیانیہ نہیں بھی ہے لیکن اپنے اندر بہت سے معنی پوشیدہ رکھتی ہے جب کہ "خواب رو" میں جو تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت کے بعد مہاجر و انصار کی نفرتوں و سمجھوتوں کو قلم بند کیا گیا ہے۔ عبدالصمد کا ناول "شکست" کی کہانی ایک نو عمر شرمیلے لڑکے کے جنسی، معاشرتی اور تعلیمی سفر کی نفسیاتی کہانی ہے جس کی بے راہ روی کا نتیجہ موذی بیماری کی صورت میں نکلتا ہے۔ "نمبر دار کا نیلا" میں سید محمد اشرف انسانی نفسیات کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ترنم ریاض کا ناول "مورتی" ذہنی ہم آہنگی کے موضوع پر مبنی ہے جس میں ذہنی فقدان کی کمی کے نتیجے میں بیوی نفسیاتی مریضہ بن جاتی ہے۔ علی امام نقوی ناول "تین بتی کے راما" کے ذریعے ممبئی جیسے بڑے شہروں کے گھروں میں کام کرنے والے لڑکوں کی سوچ، جنسی استحصال اور ممبئی کے سیٹھوں کے بیڈروم کے راز آشکار کرتا ہے۔ خورشید ربانی کے مطابق اردو ناول میں علم نفسیات کی شاخ شعور کی رو کا پہلی دفعہ استعمال "لندن کی ایک رات" میں کیا گیا جو کہ لندن میں مقیم ہندوستانی طلبہ کی نفسیاتی کیفیات پر

مبنی ہے۔ محمد فیصل کے مضمون کے مطابق سجاد ظہیر کے ناول "لندن کی ایک رات" پر یولی سس کے قصے "ڈبلن کے ایک دن کا قصہ" کی چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔ وقار عظیم کے مطابق:

> "اس مختصر ناول میں کرداروں کے عمل اور جذباتی ہیجان کے پیچھے کوئی نہ کوئی نفسیاتی گرہ ہے۔ زندگی کے پس منظر میں ہر وقت اس کے انتشار کا احساس ہے۔ سیاست اور زندگی میں یکایک جو گہرا ربط پیدا ہو گیا ہے اس کا پرتو ہے۔ جنس اور اس کے مسائل کو ایک علمی نقطہ نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس ناول کا انداز سرتا فکری ہے اور اس فکری انداز نے ہندوستان اور اس سے باہر یورپ کے ذہن کی الجھنوں کی مصوری کی ہے۔"(۵۷)

راجندر سنگھ بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" میں ہندوستانی معاشرے میں بیوہ عورت کو درپیش مسائل اور اس کی کیفیات اور نفسیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ محمد حمید شاہد کا ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" مٹی سے محبت کرنے والوں کی نفسیاتی گرہ کشائی پر مبنی ہے خالدہ حسین کا "کاغذی گھاٹ" جاگیر دارانہ و سرمایہ درانہ لوگوں کی ذہنی کیفیات کا احاطہ کرتا ہے۔ جنس نگاری کے فروغ کے حوالے سے ناقدین کے تنقید کا باعث بننے والا عزیز احمد کا ناول "گریز" مغربی تمدن، مشرقی تہذیب، جنسی محبت کے احساسات، نفسیاتی دروں بینی، عالمی جنگوں کے سماج اور افراد پر خوف کے اثرات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے کیف زندگی اور حقیقی صورت حال کے بیانیہ پر مشتمل ہے۔ ناول کے مطابق عالمی جنگوں کے بعد یورپ اخلاقی بحران کے ساتھ شدید خوف کی لپیٹ میں ہے۔ ناول میں یورپی تہذیب کا مشرقی تہذیب پر اثرات کا مطالعہ ہندوستانی کردار نعیم کے حوالے سے ملتا ہے۔ محمد فیصل کے نزدیک عزیز احمد کے ناول "ہوس"، "شبنم"، "ایسی بلندی ایسی پستی"، "گریز" اور "آگ" کا مطالعہ لطیف رومانی احساسات کا باعث بنتا ہے۔ عزیز احمد زندگی کے الجھنوں کو جنسی مسائل کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے فکر و فن پر D.H Lawrence کے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا ناول "چمکی" بڑی عمر کی عورت کے معاشقے اور اس کے جذبات کی عکاسی پر مبنی ہے۔ قاضی عبد الغفار کا ناول "لیلی کے خطوط" میں لیلی جو کہ بیسویں صدی کے طوائف کی نمائندگی کرتی ہے مذہب، سماج اور کھوکھلی اقدار کے خلاف نہ صرف سراپا احتجاج ہے بلکہ شدید بیزاریت کا اظہار کرتی ہے۔ لیلی کے یہ خطوط، لیلی کے ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کا بخوبی اظہار کرتے ہیں۔ محمد فیصل کے مضمون "اردو ناول کا نگار خانہ" آغاز سے ۱۹۴۷ء تک" کے مطابق جدید تکنیک کے تجربے کے باوجود "ایامی" جیسے ناول کو نظر انداز کیا گیا ہے جس میں ایک بیوہ کی نفسیاتی کیفیت کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ تہذیب کی عکاسی کرنے والا

رتن ناتھ سرشار کا ناول "فسانہ آزاد" انسان کے جذباتی اور ذہنی نظام کی علمبردار ہے۔ مضمون کے مطابق "فسانہ آزاد" ہسپانوی ناول نگار سروانتے کے ناول Don Quixote کے طرز پر لکھا گیا ہے لیکن" پنڈت رتن ناتھ سرشار پر سروانتے سے زیادہ Sir Roger De Coverly کا زیادہ اثر ہے"۔[۵۸] مرزا محمد سعید کے یہاں انسانی نفسیات کا حوالہ ملتا ہے۔ مضمون میں ان کے دو ناولوں "خواب ہستی" اور "یاسمین" کا ذکر کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں ناقدین کی جانب سے نظر انداز کیے جانے والے آغا شاعر کے ناول "ہیرے کی کنی" اور "ارمان" اردو میں نفسیاتی ناولوں کے ارتقا کو سمجھنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کا ذکر جہاں قیام پاکستان کے بعد کی صورت حال کی پیشکش کے حوالے سے کیا جاتا ہے وہیں ناول میں خواتین کے نفسیاتی کشمکش کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ناول میں متوسط طبقے کے مسلمان خواتین کی فطری پیچیدگیوں اور نفسیاتی کشمکش کی عکاسی عمدگی سے ملتی ہے۔ ڈاکٹر امجد طفیل نفسیاتی حقیقت نگاری کے ذیل میں بھی کئی ناولوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے عزیز احمد کے ناول "شبنم" کا ذکر ملتا ہے جو فرد کے کردار پر جنسی جبلت کے اثرات پر مبنی ہے۔ ناول میں ارشد اور شبنم کا محبت کے بارے میں متضاد نقطہ ہائے نظر کشمکش کا باعث بنتے ہیں۔ اودھ کے زوال پذیر جاگیر دارانہ تمدن پر مبنی ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول "شام اودھ" کا کردار نوبہار، نواب صاحب کے دل و دماغ پر قبضہ جمانے کے لیے نفسیاتی حربے استعمال کرتی ہے۔ ناول میں زوال پذیر تمدن کے ساتھ فرد کی باطنی اور ذہنی کشمکش کی عکاسی بھی عمدگی سے ملتی ہے۔ ممتاز مفتی کے "علی پور کا ایلی" میں احمد علی کا عورت کی جانب شدید میلان رکھنے کا اثر اس کے بیٹے ایلی کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ احساس کمتری کا شکار ایلی عورت سے نفرت اور عورت کے لیے کشش کے متضاد جذبات رکھتا ہے۔ بظاہر تو باپ سے نفرت کرتا ہے لیکن لاشعوری طور پر باپ کے نقش قدم پر چل پڑتا ہے۔ الطاف فاطمہ کا ناول "دستک نہ دو" ایک نسوانی کردار کی کہانی ہے جس کے لیے چائنہ مین سے انس ایک تلخ یاد بن جاتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاش بہاراں" کا راوی بظاہر تو کنول کماری کے لیے عقیدت رکھتا ہے لیکن اس کے جذبات کہیں کہیں ظاہر ہو جاتے ہیں جب کہ "آتش رفتہ" میں جذبات کی حدت سے مختلف رنگ پیدا کیے ہیں۔ اس ناول کا مضبوط کردار دلدار سنگھ بیٹے کی موت اور شوہر کے پھانسی کے باوجود بھی اپنے پوتے کی پرورش اس عزم و حوصلے سے کرتی ہے کہ کل کو بڑا ہو کے اپنے خاندان کا انتقام لے گا اور وہ بستی میں سر اٹھا کر چل سکے گی۔ ریگستان کے قبائلی بستی کی کہانی پر مبنی ناول "روہی" کا تذکرہ بھی نفسیاتی حقیقت نگاری کے رجحان کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اکرام اللہ کا ناول "گرگ شب باراں" محرمات کے درمیان جنسی تعلق اور اس

کے نتیجے میں شدید نفسیاتی انتشار پر مبنی ہے۔بانو قدسیہ کے "راجہ گدھ" کے متعلق مضمون نگار یوں اظہار خیال کرتا ہے:

> "بانو قدسیہ نے اس ناول میں نوجوان کے ذہنی وجذباتی مسائل کو پیش کیا ہے۔اس ناول کے مختلف کردار قیوم، آفتاب، سیمی، امتل، پروفیسر سہیل سب اپنی اپنی سطح پر نا آسودہ اور ذہنی بحران کا شکار ہیں"(۵۹)

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نفسیاتی حقیقت نگاری کے تناظر میں اکرام اللہ کے "گرگ شب" پر بحث کرتے ہیں۔ان کے مطابق "ناول کی ساری اہمیت اس کی نفسیاتی حقیقت نگاری پر مبنی بیان میں ہے جو بعض مقامات پر طویل اور کہیں کہیں علمی بحث کی شکل بھی اختیار کرتی ہے خصوصاناول کے آخر میں"(۶۰)۔"گرگ شب" زنائے محرم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شفیع / ظفر کی کہانی ہے۔جس کی والدہ کی شادی ایک بوڑھے زمین دار سے ہوتی ہے لیکن وہ اپنے جوان سوتیلے بھائی اور ماں کے تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے سماج کی جانب سے حرامی کہا اور سمجھا جاتا ہے اور یہ ساری چیزیں اسے شدید ذہنی انتشار میں مبتلا رکھتی ہیں حتی کہ وہ جنسی وصال کی صلاحیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے لیکن اس کی یہ محرومی خالص نفسیاتی نوعیت کی ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد بھی اسے عورتوں میں کشش محسوس ہوتی ہے لیکن ایسے کسی لمحے میں اسے اپنی ماں یاد آجاتی ہے تو وہ جنسی بے چارگی کا شکار ہو جاتا ہے جب کہ اس کے نزدیک وہ اپنے جیسے کسی بچے کو جنم دینے سے خوفزدہ ہے۔گھر والوں کی طرف سے دیا گیا نام اسے اس کی حرامی شناخت کی یاد دلاتا ہے جس سے نجات کے لیے وہ اپنا نام ظفر رکھ کر معاشرے کے معزز شخص کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔اپنی دانست میں اپنے ماضی کو قتل کر کے صرف حال اور مستقبل کو توجہ مرتکز رکھنا چاہتا ہے لیکن حرامی شناخت کا پیدا کردہ خلا اس کے وجود میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے حتی کہ خوابوں میں بھی اسے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کچھ عرصے میں غلاظت پر بھنکنے والی مکھی، ہزار پاؤں والے کنکھجورے، کینچوے یا سیاہ جونک میں بدل جائے گا جس سے اس کے ساتھ دیکھنے والے کو بھی گھن آئے گی یوں اس کی ہر کوشش اس کے نفسی بحران میں اضافے کا باعث ہی بنتی چلی جاتی ہے تو ایسی حالت میں یا تو کوئی شخص، پاگل ہو سکتا ہے یا خودکشی کر سکتا ہے، مجرم، جابر و قاہر سلطان یا پھر مصلح بن سکتا ہے۔ناول میں ایک جگہ خدا کو گم شدہ متصور کر کے سماج کو مطلق و مقتدر ہستی کے طور پر پیش کیا گیا ہے تو دوسری جگہ پر سماج میں خدائی عمل دخل کو تقدیر کا کھیل ہی سمجھا گیا ہے جس کا شکار ظفر بھی ہوا۔ڈاکٹر غفور شاہ قاسم کے مطابق انتظار حسین تقسیم ہند اور مہاجرت برصغیر پاک و ہند کے نتیجے میں پیدا

ہونے والی نفسیات یعنی ہجرت، خواب، یادیں، یادوں کی باز آفرینی اور شناخت کے بحران کو موضوع بناتے ہیں۔ ناول "چاند گہن" میں قیام پاکستان کے بعد دیگر مسائل کے ساتھ انسان کو بقا جیسے سنگین مسئلے کا بھی سامنا ہے جس نے انہیں خوف وہراس میں مبتلا کیا۔ مضمون کے مطابق ناول کا باب "چاند گہن" جو کہ اس ناول کا Focal point ہے پر ٹی ایس ایلیٹ کے "ویسٹ لینڈ" کے گہرے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کے بنیادی نظریے کے مطابق آدمی صرف وہی کچھ نہیں ہے جتنا نظر آتا ہے بل کہ اس کے رشتے خارج سے زیادہ باطن میں پھیلے ہوتے ہیں جس کا سرا ماضی میں جا ملتا ہے۔ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ جیسے ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ گیا ہے اس لیے ماضی کی بازیافت میں اس کی اپنی ذات ماضی میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ناقدین "بستی" ناول کو انتظار حسین کا آٹو بائیو گرافیکل ناول قرار دیتے ہیں۔ ناول میں ہجرت کے نتیجے میں مہاجروں کی شخصیت پر پڑنے والے گہرے اثرات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جس کی مثال ذاکر اور ذاکر کی ماں کی صورت میں موجود ہے یہ کردار جس طرح بار بار ماضی کو یاد کرتے ہیں اور اپنے آبائی وطن سے علیحدگی کی صورت میں اپنی ذات کو کٹا ہوا محسوس کرتے ہیں اسی طرح ذاکر کا ہندوستانی دوست سریندر بھی اپنے دوست کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتا ہے اوراس کے بغیر اس بستی میں قدم نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ بستی اس ادھورے آدمی کو پہچاننے سے انکاری ہے۔ یوں یہ ناول اپنی زمین سے بچھڑنے اور تہذیب و ثقافت کے نابود ہونے کے کرب کے ساتھ شناخت کے بحران پر مبنی ہے۔ ناول نگار ماضی کی بازیافت کے لیے تلازمہ خیال، شعور کی رو جیسے تکنیک کا سہارا لیتا ہے۔ ناول "تذکرہ" میں ہجرت کے بعد بحالی اور آبادکاری کے ساتھ اپنے سابق وطن سے الگ ہونے کے بعد کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا عمیق مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ناول نگار سیاسی واردات کو واقعاتی سطح سے الگ کر کے وسیع تر انسانی سطح تک لے جاتے ہیں۔ ناول "آگے سمندر ہے" میں بھی مہاجروں میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی ونفسیاتی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناول میں پاکستانی مہاجرین کے ساتھ ہندوستان میں رہ جانے والے عزیز و اقارب کے ذہنی وجذباتی کوائف اور تباہی کی داستان بھی ملتی ہے۔ اس ناول میں بھی کہانی کے پس منظر میں تاریخ میں شامل ہجرت کے مختلف قصوں کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ شعور سے لاشعور کا رشتہ جوڑ دیتے ہیں ناول کا کردار جواد اس کی مثال ہے۔ اس ناول کے کردار بھی (مرزا صاحب، کربلائی چچا، سیدانی چچی و دیگر) وقتاً فوقتاً اپنے وطن، اس کے رسم ورواج کو یاد کرنے کے ساتھ نئے ملک میں رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہی ان کے جینے کا وسیلہ ہے۔ سعید ساعی ناول "زوال" کی کہانی کو تیسری دنیا کے سماج کا باطنی پورٹریٹ کہتے

ہیں۔ناول میں مرکزی کردار احسن کی صورت میں تیسری دنیا کی سماجی اور نفسیاتی حیثیتوں کو آشکار کر کے دکھایا ہے کہ لا قانونیت، ظلم ،ناانصافی اور جبر کا شکار پاکستانی معاشرے کا فرد احسن زندگی کے دکھ سہتے رفتہ رفتہ اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں کھو دیتا ہے اور نفسیاتی مریض بن کر آخر میں ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں مر جاتا ہے۔

عابد میر اور فیصل ریحان کے مطابق پروفیسر راز محمد خان اپنے ناول "دی ہولی سنرز" میں جنسی تعلقات کو فلسفیانہ تناظر میں دیکھتے ہیں۔ڈاکٹر سید زبیر شاہ کے مطابق بچپن کے رشتے اور بے جوڑ شادیاں ہمارے یہاں بہت سے مسائل کی پیداوار ہے۔ایسے ہی موضوع پر مبنی زیتون بانو کا ناول "برگ آرزو" سماجی ریت رواج کے ہاتھوں معصوم جذبوں کے قتل پر مبنی ہے۔ناول میں مکالموں کی مدد سے کرداروں کی نفسیات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔اختر رضا سلیمی کا ناول "جاگے ہیں خواب میں" تاریخ سے شروع ہو کر فلسفہ وقت اور فلسفہ موت کا احاطہ کرتے ہوئے نفسیات کے دائروں میں شامل ہو جاتا ہے مضمون نگار اس ناول کے متعلق خالد محمد فتح کے کے درج ذیل اقتباس سے استفادہ کرتے ہیں:

> "جاگے ہیں خواب میں جادوئی حقیقت نگاری کی اعلی مثال ہے۔۔۔اختر رضا سلیمی بیک وقت نفسیاتی فلسفے ECP اور اواگوں اور جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیکوں کو برتتے ہوئے تاریخ، تہذیب، جنیاتی سائنس اور معاشرتی پیچیدگیوں کا بیان ایسے دلچسپ پیرائے میں کرتا ہے کہ اختتام پر ناول کی ضخامت کم معلوم ہوتی ہے۔"(۶۱)

محمد حمید شاہد کے مضمون کے مطابق خالد جاوید کے ناول "موت کی کتاب" کی بنت نفسیاتی سطح پر کی گئی ہے اس کے بغیر ناول کے کرداروں کی تفہیم نہیں ہو سکتی۔رحمٰن عباس کا ناول "روحزن" کرداروں کے ذہنی، جذباتی، نفسیاتی بیان پر مبنی ہے۔ناول کے مطابق بچہ جب والدین میں کسی ایک یا دونوں کی جنسی وابستگی کسی اور کے ساتھ دیکھ لیتا ہے تو یہ اس کے روح کو پر حزن بنالیتا ہے جس کے علاج کے لیے وہ خود بھی مجامعت کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔عاطف علیم کا ناول "مشک پوری کی ملکہ" جانوروں، شکار اور شکاری کی نفسیات پر مبنی ہے جب کہ دوسرا ناول "گرد باد" میں کرداروں کی تعمیر دو سطحوں یعنی ماجرائی اور ذہنی و نفسیاتی سطح پر کی گئی ہے۔ناول میں آمریت کے دور کے معاشرے کی مذہبی انتہاپسندی، جاگیردارانہ استبداد، جہالت، گھٹن، تعصب، ظلم اور ناانصافیوں کو بیان کیا گیا ہے۔یونس جاوید کے ناول "کنجری کا پل"، رفاقت حیات کے ناول "میر واہ کی راتیں"، حفیظ خان کے "انواسی" نجم الدین احمد کے "کھوج" کا مسئلہ سماجی زندگی ہے جس کے

عقب میں انسانی نفسیات کی اتھل پتھل بھی کام کر رہی ہوتی ہے۔سید کاشف رضا کے "چار درویش اور ایک کچھوا" دیگر بہت سے موضوعات کے ساتھ مرد اور عورت کے تعلق سے پھوٹ پڑنے والی جنسی لذت کو بھی موضوع بناتا ہے۔ڈاکٹر امجد طفیل اور مبین مرزا کے یہاں "میر واہ کی راتیں" کا ذکر نفسیاتی حوالے سے کیا گیا ہے مبین مرزا کے مضمون کے مطابق

> "اس ناول کا مرکزی کردار بہ ظاہر ایک نارمل نوجوان نظر آتا ہے لیکن اپنے ذہنی اور عملی مسائل کی روشنی میں وہ کچھ ایسی نفسیاتی کیفیت کا اظہار کرتا ہے کہ جس سے اس کی پیچیدہ شخصیت پر منہ زور جبلی خواہشوں کا غلبہ محسوس ہوتا ہے۔ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے عصر حاضر میں فرد کی تنہائی، رشتوں کی مادیت اور سماجی اقدار کی شکست کا احساس ابھارا ہے۔"(۶۲)

امجد طفیل کے مضمون کے مطابق ناول نگار "خس و خاشاک زمانے میں "انسانی فطرت کے اس اہم نکتے کو گرفت میں لیتے ہیں کہ انسان بنیادی طور پر خود غرض اور اپنی ذات کا اسیر ہے۔مذہب اور تہذیب کی جکڑ بندیاں اس کے بنیادی فطرت میں تبدیلی نہیں لا سکتے۔جس طرح نہال سنگھ کے بیٹے مسلمان ہونے کے باوجود بھی اپنے پرانے خصائص پر قائم رہتے ہیں۔ ڈاکٹر فرید حسینی کے مطابق ناول "خس و خاشاک زمانے میں" میں شناخت ،عقیدے، نسل اور معاشرت کے مسائل کو بشریات اور نفسیات کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔کہانی کا دورانیہ ۲۰۰۱ء تک پھیلانے کا مقصد بھی شناختی بحران اور Genetic تسلسل دکھانا ہے جس میں تیسری نسل کے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔اکرام اللہ کا ناول "آواز کے سائے "کا مرکزی کردار فلیش بیک کی تکنیک کی مدد سے اپنی زندگی میں آنے والی عورتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو ناول میں سموتا چلا جاتا ہے۔خالد محمد فتح کے آرٹیکل کے مطابق نفسیاتی عدم توازن اگرچہ وجودی نہیں تاہم موجود ہوتا ہے اور انسانی رویوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔اور نجم الدین احمد کے تینوں ناولوں میں انسان کا یہی نفسیاتی الجھن موجود ہے۔"مدفن" کا کردار خود ساختہ الجھن کے ہاتھوں نفسیاتی ڈھانچہ بن جاتا ہے۔"کھوج" کا کردار سسی پنوں کی کہانی سن کر سسی کے قبر کی تلاش میں نکل جاتا ہے جب کہ "سہیم" کا نسوانی کردار مرنے سے پہلے شوہر کو بتاتی ہے کہ حجلہ عروسی میں اس کے ساتھ چار اور افراد بھی داخل ہوتے ہیں جس سے وہ شدید نفسیاتی اتھل پتھل کا شکار ہو کر نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔اظہر حسین کے مطابق کام، شراب اور عورت خالد محمد کے ناول "پری" کے بنیادی اکائیوں میں سے ہے۔دیگر خوبیوں کی ساتھ مضمون نگار کرداروں کے سماجی و نفسیاتی مطالعے کے لحاظ

سے ناول نگار کو کامران ٹھہراتے ہیں جب کہ نیم خود کلامی پر مبنی ان کا ناول "ٹبا" میں "مرکزی کردار کی نفسیاتی و روحانی کشمکش اسے اپنے برسوں پہلے دیکھے اور محسوس کیے ہوئے مکان سے ایک نئے زاویے اور انوکھے احساس سے دوبارہ آملاتی ہے"(۶۳) مضمون کے مطابق ناول میں طلسمی حقیقت نگاری کے حوالے سے لاطینی امریکی فکشن نگاروں کی تقلید کی گئی ہے جب کہ "اے عشق بلاخیز" کے کردار نوید، وصی اور عنبر جبلت کے اسیر ان ہیں اور ہر وقت جنسی آسودگی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ناول "زینہ" کے ہادیہ کا ذکر بھی اسی حوالے سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان "خوشیوں کا باغ" کے مرکزی کردار چیف اکاؤنٹنٹ کا ذکر نفسیاتی تناظر میں کرتے ہیں جو کہ اپنے داخلی کرب اور انتشار کا علاج جنسی سہارے میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ خارجی واقعات، اندرونی انتشار اور تناؤ کی بدولت دفتری امور انجام نہ دے سکنے کی بدولت ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اسے ایک سال سزا ہو جاتی ہے۔ ناول "ایک ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" اپنے تھیم "یعنی جہاں مرد ختم ہوتا ہے وہاں سے عورت شروع ہوتی ہے" کو بخوبی آگے بڑھاتا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق اصغر ندیم سید کے اس ناول کا بنیادی سوال عورت کے بارے میں ہے۔ جس کا ذکر وہ یوں کرتی ہیں:

> "عورت اس ناول کا مرکزی سوال ہے۔ عورت کس طرح اپنی کمزوری کو اپنی قوت میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور کیسے مرد اپنی تمام تر جسمانی اور سماجی طاقت کے باوجود عورت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مرکزی قضیہ ہے جس کے ارد گرد کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔"(۶۴)

ڈاکٹر شہناز شورو کے مطابق طاہرہ اقبال کے ناول "نیلی بار" میں فطری جنس کی طلب مرد و زن دونوں میں بھرپور اشتیاق کے ساتھ ملتی ہے۔ ذوالفقار احسن ناول "میرا گاؤں" میں دیہاتی کرداروں کا نفسیاتی تناظر میں بھی ذکر کرتے ہیں۔ ناول میں سے بچوں کی نفسیات پر ماحول کے اثر انداز ہونے کے حوالے سے اقتباس شامل مضمون کیا گیا ہے جب کہ لطیف جذبات کی عکاسی کے حوالے سے ماہنا، ریشماں کا اور اسلام بھا اور حمیداں کا حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان کے مطابق نیلم بشیر ناول "طاؤس فقط رنگ" کے کرداروں کے نفسیاتی مسائل کو احسن طریقے سے پیش کرتی ہے اس سلسلے میں ڈایلائلہ، شیری، مراد اور ان کے خاندانوں کے نفسیات خاص طور پر روایتی ماؤں کی نفسیات کو بھی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ ازدواجی تعلقات اور جنسی عمل کے دوران عورتوں کی کیفیات مردوں سے الگ نوعیت کی ہوتی ہیں جنسی امتیاز کا یہی

حوالہ اس ناول میں پایا جاتا ہے۔ مصنفہ نے کرداروں کے ذہنی افکار اور احساسات کی پیش کش کے لیے شعور کی رو، اندرونی خود کلامی، مبہم باتوں اور فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔

نو آبادیات/مابعد نو آبادیات:

عبد اللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" نو آبادیاتی عہد کے استعماری سازشوں کا پردہ بخوبی چاک کرتا ہے۔ اس دور کے مختلف طبقوں کی زندگی کے شب و روز نمایاں کرنے میں ناول کا کردار اہم ہے۔ ناول استعماری دور کے ہندوستانی معاشرے کو دو واضح صورتوں میں بٹتا ہوا دکھاتا ہے۔ ناول دکھاتا ہے کہ کس طرح غریب کسانوں کی مجبوریوں اور لاچاریوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے یوں جہاں ایک طرف غربت اور افلاس کے ڈھیرے ہیں تو دوسری طرف عیش و نشاط کی محفلیں برپا کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

عبد اللہ حسین کا دوسرا ناول "نادار لوگ" پس نو آبادیاتی دور کے سماجی رویوں کو موضوع بناتا ہے۔ ناول دکھاتا ہے کہ کس طرح مزدور اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقے نسل در نسل غلامی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے حق کے لیے آواز تک نہیں اٹھا سکتے۔ محمد عباس کے مضمون کے مطابق:

> "عبد اللہ حسین کی ناول نگاری کا نو آبادیات کے تجزیہ سے شروع ہونے والا سلسلہ نادار لوگ تک پہنچتے پہنچتے نو آبادیاتی عہد سے بڑھ کر پس نو آبادیاتی عہد کی سیاست، سماج اور کلچر کی بھرپور عکاسی کرتا چلا آرہا ہے۔ بحیثیت مجموعی نادار لوگ کا اردو کے ان نمائندہ ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جو پس نو آبادیاتی عہد کی سیاسی اور سماجی صورت حال کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔"[۶۵]

ڈاکٹر آصف فرخی کے مطابق سعید نقوی کا ناول "وبا" مابعد نو آبادیاتی صورت حال کی علامت ہے۔ فیصل ریحان کے مطابق خالد اقبال جوئیہ کا ناول "پڑاؤ" تاریخی، سیاسی و سماجی تناظر کے ساتھ مابعد نو آبادیاتی تناظر کا بھی حامل ہے۔ پڑاؤ کی کہانی بلوچستان میں معدنیات کے ذخائر کی تلاش میں لگائے گئے کیمپ کے گرد گھومتی ہے جو کہ مقامی سرداروں کی ناپسندیدگی اور سازشوں کی بدولت ناکام ہو جاتا ہے۔

ردنو آبادیات:

ایم خالد کے مطابق رد نو آبادیاتی بیانیے کا آغاز سب سے پہلے پریم چند کے ناولوں سے ہوتا ہے۔ پریم چند کے ناول "چوگان ہستی" سے شروع ہونے والے رد نو آبادیاتی بیانیے کی حدت ان کے ناول "گوشہ عافیت" میں دیکھنے کو ملتی ہے جب کہ اس حدت میں شدت ناول "میدان عمل" میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسلم سحاب

،سجاد ظہیر کے ناول:لندن کی ایک رات" کو رد استعماریت کے تناظر میں زیر بحث لاتے ہیں۔ان کے مضمون کے مطابق ترقی پسند ادیبوں کی طرح سجاد ظہیر نے بھی سیاسی، سماجی اور ثقافتی ہر سطح پر ظلم و ستم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ جس کی عکاسی اس ناول میں بھی ملتی ہے۔ناول نگار نے معاشی انصاف، آزادی اور مساوات کا رجحان جو کہ سامراجی دور میں ہندوستان کے لوگوں کو حاصل نہیں تھا کو طلبا کی زبانی پیش کیا ہے۔پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف کے مطابق:

> "لندن کی ایک رات میں اصل مسئلہ سامراج اور استحصالی قوتوں سے آزادی کا حصول ہے۔ سجاد ظہیر پر امید ہے کہ پہلے انسان آزادی کی خاطر سیاسی و سماجی انقلاب برپا کرے گا،پھر فطرت کی اندھی قوتوں کو مغلوب کرتا جائے گا یوں ہی جنت ارضی کا امکان روشن ہو گا"(۶۶)

مصنف ناول کے ابتدائی صفحات پر ہی ہندوستان میں رونما ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے انگریزی سامراج کو پیغام دیتے ہیں کہ اب زیادہ دیر تک وہ ہندوستان کو اپنی غلامی میں نہیں رکھ سکیں گے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی کے مطابق مرزااطہر بیگ کے ناول "غلام باغ" کومابعد نو آبادیاتی تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے کیوں کہ ناول سیاسی نظام کی حرام کاریوں، سماجی نظام کی بدکاریوں، ظلم اور استحصال پر مبنی ہے۔یہ زمینی اشرافیہ بے زمین ذاتوں کے لوگوں کو انسان ماننے سے بھی گریزاں ہیں لیکن پھر یہی اشرافیہ انتخاب کے وقت دیگیں بانٹ کر رقمیں تقسیم کر کے انہی کم ذاتوں کا استعمال کر کے اسمبلیوں میں پہنچ کر عوام کے خلاف محاذ بنا لیتے ہیں۔

> منیر فیاض کے "عالمی افسانوی بیانیے کا اجمالی ارتقا اور انو اسی" کے مطابق یہ ناول مابعد نو آبادیاتی اور نو استعماری رویے کی شناخت میں دیتا ہے۔"ان دونوں بیانوں کے juxtaposeہونے سے Intetextual اور Cross cultural مطالعے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔"(۶۷)

تانیثیت:

ادبیات کے مجلوں میں عبد اللہ حسین کے ناول "قید" کے نسوانی کرداروں کا جائزہ تانیثی حوالے سے لیا گیاہے مثلاً ڈاکٹر جمال نقوی ناول "قید" کے مرکزی نسوانی کردار کو سماجی اقدار کے خلاف بغاوت کرنے پر روشن خیالی کا ستعارہ قرار دیتا ہے۔ڈاکٹر محمد افضال بٹ "قید" کو ایک ایسے سماج کی عکاسی قرار دیتے ہیں جس میں عورت پابندی، جبر اور گھٹن کا شکار ہے جہاں سارے حقوق مردوں کو حاصل ہے۔ناول کا مرکزی کردار

رضیہ طبقہ نسواں کے فروغ، آزادی اور برابری کے حقوق کے لیے سماج سے بغاوت کرتی ہے نتیجے میں جان کی بازی ہار جاتی ہے۔ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان اپنے مضمون میں ڈاکٹر عقیلہ جاوید کا عبد اللہ حسین کے یہاں عورت کے تصور سے متعلق درج ذیل اقتباس شامل کرتی ہیں کہ

> "عبد اللہ حسین کے ناولوں میں مرد عورت کا حق ادا نہیں کر پاتا۔ وہ عورت کو صرف جنسی آلہ کار بناتا ہے۔ لیکن اسے اپنی زندگی کے لیے اہم نہیں گردانتا۔ یہی وجہ ہے کہ "اداس نسلیں" کا ہیرو نعیم عذرا سے کھنچا کھنچا رہتا ہے۔ اسی طرح "باگھ" کا اسد یاسمین سے محبت تو کرتا ہے مگر اس کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں مرد عورت سے سپردگی چاہتا ہے اور اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے اس کی جوانی اور خوبصورتی سے فیض یاب ہوتا ہے مگر اس کے لیے فنا نہیں ہوتا۔ ان کے ناولوں کی عورت کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ وفا شعاری، قربانی، سپردگی کا اس کے لیے اس دنیا میں کوئی انعام نہیں۔"(۶۸)

ڈاکٹر سبینہ اویس ناول "قید" میں رضیہ کے کردار کو حقوق نسواں کے فروغ کے تناظر میں دیکھتی ہے جو کہ مردوں کے اس معاشرے میں مظلوم ہو کر خاموش نہیں بیٹھتی بل کہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لیتی ہے۔ عبد العزیز ملک کے مطابق ناول کا ایک موضوع مرد اساس معاشرے میں عورت کی قید بھی ہے۔ پدر سری معاشرے میں عورت بھی مرد کے ملکیتی اشیا میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا جسم، جنسی جذبات اور خواہشات سب پر مرد کا تصرف ہوتا ہے۔ جاگیر داری سماج میں عورت کو پاؤں کی جوتی برابر سمجھا جاتا ہے۔ ناول کے نسائی کردار مثلاً مائی سروری اور نسرین مردوں کی حکمرانی کے آگے ہار جاتی ہیں جب کہ ایک نسائی کردار رضیہ سلطانہ اس نظام سے بغاوت کرتی ہے اور عورتوں کی برابری کے حقوق کا مطالبہ کرتی ہے اور اس نظام سے ٹکرانے کی صورت میں موت اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کے مطابق عبد اللہ حسین کے ناولوں میں پیش کردہ عورتوں کے کردار سرپرائزنگ ہوتے ہیں۔ "باگھ" کی یاسمین، "اداس نسلیں" کی عذرا، "نادار لوگ" کی سکینہ، اور "قید" کی رضیہ اپنے اندر مزید نسائی قوتیں رکھتی ہیں۔ "نشیب" کی کوثر اور نسیم جبکہ "رات" کی جمال ہر حال میں اپنے گھر کو ہی معتبر گردان کر اس کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ عبد اللہ حسین کے یہاں عورت محبوب کی بجائے عاشق کا رول پلے کرتی ہے۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی کا مضمون عزیز اعجاز کے ناول "پشیمان چاہتیں" کو تانیثی حوالے سے کچھ یوں بیان کرتا ہے:

"'پشیمان چاہتیں' کا مرکزی کردار ایک ماہر کرکٹر عاصم ندیم ہے۔ لیکن اس کا پلاٹ تین لڑکیوں شیبا، سدرہ، سجاتا کے دکھوں سے بنا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے کہانی کو تانیثی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو فی زمانہ خواتین کی مختلف سماجی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ مشرقی سماج کی عورت جو محبت کا پیکر ہے اور ساتھ نبھانے کے لیے سب کچھ مٹانے اور بہت کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے لیکن اس کی اپنی قسمت میں بالآخر لاحاصلی ہوتی ہے۔ عورت جو غریبی کی حالت میں مرد کا سہارا بنتی ہے لیکن وہ خود اس وقت محرومی کا شکار ہوتی ہے جب اسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت گلیمر کی دنیا میں بہت آگے جاتی ہے لیکن سماج کی زمینی حقیقتیں اس کے سامنے کسی اور روپ میں آتی ہیں۔"(۶۹)

شائستہ فاخری اپنے ناول "نادیدہ بہاروں کی تلاش میں "علیزے کی صورت میں مضبوط کردار پیش کر کے عورتوں کو مردوں کو حصار سے نکالتی ہے۔ علیزے کے زندگی میں اعیان کی آمد کی وجہ سے اسے فرحان سے طلاق ملتی ہے لیکن پھر اعیان کی بے رخی اسے ایک ایسی عورت کے کردار میں بدل جاتی ہے جو کہ ثابت کر دیتی ہے کہ عورت اکیلے رہ سکتی ہے بچوں کی پرورش کر سکتی ہے اپنی پسندیدہ دنیا بسا سکتی ہے۔ علیزے اس سب کے لیے دوست کی مدد سے ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعے حاملہ ہو جاتی ہے نیز علیزے کی کہانی تب مکمل ہو جاتی ہے جب وہ مردوں کے اس معاشرے میں اپنی شناخت اور مضبوطی کے لیے اپنا خوابوں کا ایک گھر بنا لیتی ہے اور یہ ثابت کر لیتی ہے کہ عورت کی شناخت اپنے بل بوتے بھی مکمل ہو سکتی ہے۔ نور الحسنین ناول "نادیدہ بہاروں کے نشان" کے متعلق کچھ یوں رقم طراز ہیں"

"یہ ناول اپنے عہد سے تقریباً چالیس برس پہلے سے شروع ہوتا ہے اور اس کا اختتام آنے والے پچاس ساٹھ برسوں کی نشاندہی کرتا ہے، چالیس برس پہلے کا حوالہ اس لیے کہ آج علیزے جیسی یتیم لڑکیوں کی شادی اتنی آسانی سے ممکن نہیں اور آنے والے پچاس برسوں کا اشارہ اس لیے کہ ہندوستان میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے چلن کو عام ہونے میں کم از کم پچاس ساٹھ برس تو لگ ہی جائیں گے۔"(۷۰)

ناول "صدائے عندلیب بر شاخ "خواتین کے جنسی و معاشرتی استحصال کے موضوع پر مبنی ہے۔ سندھی تمدن کے پس منظر کا حامل یاور یعقوب کا نیم تاریخی ناول "دل بن" تین ہزار قبل مسیح سے پندرہ سو

سال قبل مسیح کے درمیان کے واقعے پر مبنی ہے۔اس قدیم تمدن مین ایک معمولی داسی دیوانئ ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھاکر روشنی کی علامت بنتی ہے۔مقالہ نگار کے مطابق:

"کہانی کا بنیادی نکتہ جبر واستحصال کی وہی علامتیں ہیں جن سے ہمارے عہد کے ہر طبقے کی عورتیں آج بھی گزر رہی ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں واقعہ تین ہزار سال قبل مسیح سے پندرہ سو سال قبل کے درمیان سے اٹھایا گیاہے۔۔۔دیو پتروں نے اسے سزا تو سنائی مگر اس نے وجود کی آزادی کے ساتھ جینے کا سندر سچا راستہ سب کو سمجھادیا۔"(۷۱)

ناول "اندھیرا یگ" راجستھان کے علاقائی ماحول کے پس منظر میں وہاں بیواؤں اور عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو بیان کرتا ہے۔صادقہ نواب سحر کا سوانحی تکنیک میں لکھا گیا ناول "کوئی کہانی سناؤ متاشا" متاشا نامی عورت کے عبرت ناک واقعات پر مبنی ہے جو باپ کے ظلم کی شکار باپ کے دوست کے ہاتھوں عزت لٹا دیتی ہے حتیٰ کہ چچا اور سوتیلے بیٹے کے ہاتھوں بھی جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ راشد الخیری عورت کی مظلومیت کو ناول "شام زندگی"، "صبح زندگی"، "شب زندگی "میں موضوع بناتے ہیں۔مرزا محمد سعید کا ناول "یاسمین "کا موضوع اگرچہ تعلیم نسواں اور تربیت اولاد ہے لیکن اس کے باوجود بھی یہ ناول تانیثیت پسندوں کے لیے بہت سے اختلافی مواد کا حامل ہے۔"شریف بیگم"، "صفیہ بیگم" اور "آج کل" کی مصنفہ محمدی بیگم نے عورتوں کے حقوق کی جنگ قلم کے ذریعے لڑی نیز خواتین کو درپیش مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ خواتین کو اپنی ذہنی اور علمی تربیت کی طرف مائل کیا۔انور سجاد کے ناول " جنم روپ"کا ذکر شہزاد منظریوں کرتے ہیں کہ:

"یہ ناول اس طرح لکھا گیا ہے جیسے معاشرے میں عورتوں کی مظلومیت کی داستان سنانا اور ویمن لیبریشن کے کاز کو تقویت پہنچانا مقصود ہو مرکزی کردار ایک ایسی عورت کا ہے جو اپنے خوابوں اور آدرشوں کے مطابق اپنی دنیا آپ تخلیق کرنا چاہتی ہے لیکن مردانہ معاشرے میں یہ ممکن نہیں "(۷۲)

نعمان نذیر "اردو ناولوں میں تانیثی شعور کا مختصر جائزہ" کے عنوان سے نسوانی کرداروں کا جائزہ پیش کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی قصہ عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔اردو ناولوں میں عورت کے پیش کردہ کردار نہ صرف عورت کے تمام تر رموز کو پیش کرتے ہیں بلکہ کچھ کردار تو حقیقی تانیثی شعور کے نمائندے ہیں۔اردو کے پہلے ناول "مراۃ العروس" کے نسوانی کردار زیادہ فعال ہیں۔ناول نگار نے اکبری کی صورت میں جہاں

کمزور کردار پیش کیا وہیں اصغری کی صورت میں ایک خاص طبقے کی سلجھی ہوئی عورت کا کامیاب کردار بھی پیش کیا ہے۔ "امراؤ جان ادا" میں طوائف کے کردار کی صورت میں عورت کے جذبات و احساسات کی تصویر پیش کی گئی ہے لیکن نام و نہاد باعزت معاشرہ ایسی عورتوں کو عزت کے ساتھ بسانے کا متحمل نہیں ہوتا۔ عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کی نور جہاں مغرب کے آزاد ماحول کے زیر اثر رہنے کے باوجود اپنی پاکیزگی اور وضعداری بر قرار رکھتے ہوئے مشرقی عورت کا رول بخوبی ادا کرتی ہیں۔ عصمت چغتائی نے عورتوں کے معاشرتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے "ٹیڑھی کھیر" کے شمن کی مثال دی جاسکتی ہے۔ قراۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" میں چمپا کے ذریعے ہندوستان کے قدیم تاریخ سے لے کر جدید دور کے ہندوستان کی عورت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ "آخری شب کے ہم سفر" میں دیپالی کا کردار ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کو درپیش حالات کے برعکس قومی سطح کے ساتھ ساتھ ذاتی سطح پر اپنے اندر انقلابی پن رکھتا ہے۔ اسی طرح "سیتا ہرن" کی سیتا بھی ایک متحرک کردار ہے۔ "چاندنی بیگم" کی بیلا اپنے اندر مثبت و منفی پہلو رکھتا ہے۔ ہندوستان کے بے حس معاشرے میں اپنی شناخت کے لیے سر گرداں اس کردار کو معاشرہ کوئی باعزت مقام دینے کو تیار نہیں۔ شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" کی سلطانہ باپ بھائی اور شوہر کا سہارا نہ ملنے کے باوجود اپنی دم پر حالات کا مقابلہ کرتی ہیں۔ "علی پور کا ایلی" میں شہزاد کی صورت میں جنسی اور نفسیاتی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے جبکہ خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" میں عالیہ کا کردار پورے ناول کا متحرک اور فعال کردار ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ناول "آبلہ پا" کا مرکزی کردار صبا جو کہ اعلی تعلیم یافتہ ہے اپنے اقدار کی پاسداری کرنے والی مشرقی بیوی کا کامیاب نمونہ پیش کرتی ہے۔ فیصل ریحان کے مضمون کے مطابق رفعت زیبا کے ناول "ناسور" کے کئی جملے ان کے نسائی شعور کے غماز ہیں۔ یہ ناول مردانہ و جاگیردارانہ سماج میں عورت کی زندگی کو المیہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار شمع سماجی و معاشی استحصال کے نتیجے میں نفسیاتی مریضہ بن جاتی ہے حتی کہ اپنی بیٹی کو بھی جان سے مار دیتی ہے۔ فیصل ریحان کے خیال میں یاسمین صوفی کے ناولوں "تلاش"، "امائمہ"، "فریحہ" اور "عاطقہ" کا مطالعہ نسائی رد تشکیل اور تانیثیت کے تھیوریز کے تحت کیا جاسکتا ہے اور یہ مطالعہ مصنفہ کے ذہنی رجحان کے ساتھ بلوچستان کے فکشن کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھنے میں مدد دے گا نیز جدید عورت اور قبائلی عورت کے مابین فرق کا بھی پتہ چل سکے گا۔ شاہنواز علی کا "آدم زادیاں" مال دار اور طاقت ور حلقوں کی جانب سے عورت کی تذلیل اس کے جنسی اور معاشی استحصال کو موضوع بناتا ہے۔ ترنم ریاض کا ناول "برف آشنا پرندے" کی کہانی ایک مسلم کشمیری

خاندان کے تہذیبی زوال پر مبنی ہے کشمیری پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول بے جا قسم کی نسائیت، عورت کی مظلومیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ثروت خان کا "اندھیرا پگ" راجھستانی سماج میں عورت کی کیفیت اور حیثیت پر مبنی ہے ناول میں "ثروت خان نے پارینہ موضوع کو ایک ایسے تازہ کار تھیم میں بدل دیا ہے جس میں بیوہ کی بپتا تانیثی بغاوت میں بدل جاتی ہے"(۴۳)۔ عاصم بٹ کے ناول "ناتمام" کی کہانی صدیوں سے مرد کے ہاتھوں عورت کے استحصال کی بار بار دہرائی جانے والی کہانی ہے۔ اس بار بار کی تکرار کا مقصد یہ ہے کہ شاید عورت کی یہ نحوست ٹل جائے جس کا سامنا صدیوں سے عورت کر رہی ہے کبھی یشودھرا کی صورت میں تو کبھی سیتا کی صورت میں۔ عرفان احمد عرفی کے مضمون کے مطابق:

> "اگر ہمارا کہانی کار یگوں پہلے سیتا سے اس کی کتھا سن کر دوسروں کو سناتا تو اس کی لکھی سیتا کے فیصلے نے رام اور سیتا کی جیون کتھا ہی نہیں آنے والے یگوں کا اتہاس بدل کر رکھ دینا تھا۔۔۔ مرد کے آہنکار کو للکار کر، اپنی اچھا سے جیون بتانے کا ادھیکار مانگنا پاپ نہ رہتا۔ سیتا ابھاگن نہ رہتی، دھتکاری نہ جاتی۔ بس اسی صورت میں اس کتھا کا انت ہونا تھا اور آج صائمہ کی کہانی "ناتمام" نہ ہوتی"(۴۴)

ناول "خواب سراب" میں مرد ناول نگار جس طرح ایک گزرے ہوئے زمانے کو نسوانی کرداروں کے ذریعے دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ زبوں حالی کی تصویروں میں وہ معاشرہ تانیثی تہذیب و معاشرت کا علامیہ ہے۔ خالدہ حسین ناول "حاصل گھاٹ" میں عدم تحفظ، نفرت اور تشکیک کی شکار عورت کے سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق کے لیے آواز اٹھاتی ہیں۔ حنیف باوا، ڈاکٹر رینو بہل کے ناول "گرد سے اٹھے چہرے" کو تانیثی ادب میں بیش بہا اضافہ سمجھتے ہیں۔ منیر فیاض کے "عالمی افسانوی بیانیے کا اجمالی ارتقا اور انواسی" کے مطابق ناول "انواسی" میں سنگری کی صورت میں پیش کردہ عورت اگرچہ عالمی ادب میں ڈھائی ہزار سال سے موجود ہے لیکن اردو میں ہیروئین کے روپ میں عورت کی طاقت کا آرکی ٹائپ ایسا کردار پہلی دفعہ سامنے آیا ہے۔ عورت کا یہ کلاسیکی تصور ہندی اساطیر کے رتی اور سیتا کے رد Anti thesis اور افرودائتی اور ہیلن کے کرداروں کا Synthesis ہے۔ مضمون میں مرکزی کردار سنگری اور انگریز کیمپ کے نسوانی کردار ایما کے تقابل کے بعد نسائی تناظر میں سنگری کے کردار کی مزید مطالعے کی سفارش کی گئی ہے۔

وجودیت:

ناقدین انتظار حسین کے ناول "آگے سمندر ہے" کو تذکرہ اور بستی کی توسیع قرار دیتے ہیں۔ ممتاز احمد خان کے مطابق انتظار حسین "آگے سمندر ہے" میں ناول "بستی" اور "تذکرہ" کے سماجی و تہذیبی مسائل کو ایک نئی جہت دیتے ہیں جو کہ سیاسی ہے اوراکیسویں صدی میں وجودی سوالات اٹھاتی ہے۔ سندھی، بلوچی، پنجابی، پٹھان اور مہاجروں سے اٹے کراچی شہر کو معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی انتشار نے ہولناک بحران کا شکار کیا۔ ناول کے دو اہم ترین کردار جواد اور مجو بھائی دہشت گردی کا شکار ہو جاتے ہیں مجو بھائی تو جان سے بھی ہاتھ دھولیتا ہے۔ ناول میں مجو بھائی ناول نگار کا Spokesman ہے جو کہ نہ صرف کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد گار ہے بل کہ طنز و مزاح کے پردے میں ایسے سوالات سامنے لاتا ہے کہ جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ جواد کے نزدیک انسان کی مثال درخت کی سی ہے اور درخت کو اکھڑنا نہیں چاہیے۔ جنگل کے سارے درخت ایک جیسی اہمیت کے حامل ہے لیکن اگر ان میں تعصبات، نفرتوں، گروہ بندیوں اور فرقہ واریت کا زہر سرائیت کر جائے تو جنگل ہرا بھرا کیسے رہ سکتا ہے؟ مضمون نگار کے مطابق:

"بحوالہ ماجرہ ناول کا یہی Vision ہے۔ اسے کراچی کی صورت حال کے محدود حوالے سے دیکھنا زیادتی ہو گا۔ یہی ہجرت ناسٹلجیا دوسری زمین میں اپنی جڑیں گہری کرنے اور اخوت کی بنیاد پر معاشرے کے خمیر کو اٹھانے اور اہل اسلام کو ایک جسد خاکی کی صورت دیکھنے کی اجتماعی خواہش کا مظہر ہے۔ اس طرح یہ عالمی سطح پر ہمارے وجود کو تباہی سے محفوظ رکھنے کا رمزیہ اشارہ ہے۔"(۷۵)

ممتاز احمد خان، انتظار حسین کے نئی جڑوں میں ایڈجسمنٹ کے تفہیم کے حوالے سے جوگندر پال کے ناول "خواب رو" کا حوالہ دیتے ہیں جب کہ انیس ناگی کے ناولوں میں ہجرت کے ساتھ دہشت گردی کے موضوع کی موجودگی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

محمد زمان ظامی وجودی فلسفے کے عناصر جیسے وجود اور تقدیر، فرد کی انفرادیت، موت کے المیاتی احساس اور تنہائی کے حوالے سے عبداللہ حسین کے ناولوں /ناولٹ "رات"، "اداس نسلیں"، "باگھ"، اور "قید" پر بحث کرتے ہیں۔ ان کے مطابق:

"مجموعی طور عبداللہ حسین نے اپنے ناولوں میں وجود، تقدیر، فرد کی انفرادیت، زندگی کی نامعقولیت، موت کے المیاتی احساس کے ساتھ ساتھ انسان کی ازلی اور ابدی تنہائی کی

داخلی کیفیات کو جس انداز سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ وجودی تصورات سے قائم نظر آتا ہے۔"(۷۶)

نورالحسنین کے مطابق صلاح الدین پرویز کا "ناول 'ایک دن بیت گیا' اس معصومیت کے نوحے کے طور پر سامنے آیا جو جدید تہذیب اور جدید شہری زندگی کے چکرویو میں پھنس کر اپنی شناخت اور اپنے وجود سے محروم ہو چکی ہے "(۷۷)۔ انیس ناگی کے ناولوں کے کرداروں کے وجود اپنے سوچنے کی عادت کی وجہ سے مختلف قسم کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جیسے کہ "وہ میرا وجود میرا شعور ہے اور میرا شعور میری سزا ہے، یعنی اگر اس کا ہیرو نہ سوچے اور اس میں شعور نہ ہو تو وہ بہت سی سزاؤں سے بچ سکتا ہے "(۷۸)۔ ان کے ناول "میں اور وہ" کا ہیرو بھی جبریت کی وجہ سے احساس محرومی کا شکار اور قنوطیت پسند ہے۔ حیات اور فطرت کے متنوع رنگوں کو پیش کرتا ناول "خوشبو کی ہجرت" کے کردار اپنی دریافت کے سفر پر نکلے ہیں جب کہ ذات کی تلاش اور حقیقت کے ادراک میں کامیابی مادیت سے بلند ہونے کی صورت میں ہی مل سکتی ہے۔ "قلعہ جنگی" میں سیاسی مسائل سے الجھنے کی بجائے مستنصر حسین تارڑ دکھاتے ہیں کہ

> "زندگی کی آس میں جیتے مرتے کردار کس طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تحفظ ذات کی حس انہیں سب سے پہلے اپنی بقا کے لیے اکساتی ہے۔ تباہی اور بربادی کے مناظر میں انسانی نفسیات کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ ناول نگار نے اسے دلچسپ انداز میں ضبط تحریر کیا ہے۔"(۷۹)

تکنیکی سطح پر شعور کی رو اور واقعہ نگاری پر مبنی شمیم منظر کا ناول "زوال سے پہلے" نوجوانوں کے اعلی اقدار کے خواب اور ان خوابوں کے چکنا چور ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والے وجودی المیے کو موضوع بناتا ہے۔ "اے غزال شب" میں مستنصر حسین تارڑ انسان کی شکستگی اور زوال کو موضوع بناتے ہیں۔ خالد محمد فتح کا ناولٹ "ٹبا" اپنی ذات کی طرف لوٹنے کا سفر ہے جس میں ملتا کم ہے ہاتھ سے چلا زیادہ جاتا ہے۔ محمد عامر رانا کے ناول "سائے" کے مطابق اگر کوئی فرد اپنی مہلک بیماری کو بھول جائے تو اس کی بیماری بھی ختم ہو جاتی ہے اور انسان موت کو شکست دے جاتا ہے۔ اسی غرض سے ناول کا کردار خود کو شہر میں گم کر دیتا ہے۔ اس ناول میں کردار سائے میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔

لایعنیت:

منیر فیاض کے مطابق ناول "گرد بار" polyphonic انداز (روایتی بیانیے کے اندر نفسیاتی بیانیہ کا ہم آہنگ ہونا ساتھ میں شاعری، تاریخ، جغرافیہ اور سیاسیات کا امتزاج بھی ہوتا ہے) کا حامل ہے۔ گرد بار پنجاب کے شہری و دیہی منظر نامے پر مبنی اسی کے دہائی کے قبل و بعد کا زمانے کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ناول کا مسئلہ انسانی قدار کے زوال کے نتیجے میں پیدا شدہ معاشرتی جبر اور اسکے نتیجے میں انسان کی شناخت اور فن کی موت ہے۔شناخت کے خاتمے اور فن کے موت کے بعد ناول کا کردار موجو موچی لایعنت کا شکار ہو کر کامیو کے ہیرو کی طرح کا Absurd ہیرو بن جاتا ہے۔اسی معاشرتی جبر کے نتیجے میں چراغاں، شمو کنجری، گم سم عورت اور حمیدا کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں تو وہ ان خوابوں کی موت کا انتقام لیتے ہیں۔یوں اکیسویں صدی کے عالمی گاؤں میں موجو، چراغا، حمیدا، شمو کنجری اور گم سم عورت تیسری دنیا کے تہرے، چوہرے استحصالی نظام کا حصہ ہیں۔ناول کفایت لفظی، Nomenclature اور طلسمی حقیقت نگاری کے اثرات کا حامل ہے۔لسانی تجربے کا حامل حسن منظر کا ناول "حسن کی صورت حال" میں انسانی زندگی کی معنویت اور ابیسرڈیٹی پوری طرح عیاں ہے۔ناول کے مطابق اس بے ربط اور بغیر منطق کے دنیا میں انسانی کردار اپنی جدوجہد سے رنگ بھرتے ہیں۔

عدمیت:

ڈاکٹر اقبال آفاقی کے مضمون "اداس نسلیں کا مرکزی کردار نعیم معنیات کے ایک نئے تناظر میں" ناول کے آخر میں نعیم کا کردار نہلزم کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ان کے مطابق فسادات کے دوران نعیم کی کہی گئی درج ذیل بے ربط نظم:

> "ننگی شاخوں پر پرندے خوراک کی امید میں بیٹھے ہیں۔۔۔نیچے ان کے خداؤں کے کارواں اپنی حمد و ثنا گاتے ہوئے گزر رہے ہیں پر پیڑ کہاں ہیں؟۔۔۔میں دنیا کے چوراہوں پر بیٹھ کر بھیک مانگتا ہوں ۔۔۔اور دنیا میں پیغمبر آنا بند ہو چکے ہیں۔۔۔اب لوگ صرف کہانیاں سنا کر چلے جاتے ہیں۔۔۔پر لوگ کہاں ہیں۔"[۸۰]

نطشے کے نہلزم کا پرتو ہے جو کہ اس تمام تر منفی صورت حال کی عکاس ہے جہاں انسان، انسان نہ رہا۔ بندر، بھیڑیے، گیدڑ اور گدھ بن گیا۔ جہاں تمام اقدار زمیں بوس ہوئیں۔یہ صورت حال سوال اٹھاتا ہے

کہ انسان، تہذیب کہاں ہے۔ پیغمبر آنا کیوں بند ہوئے انسان کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے کیوں معلق چھوڑ دیا گیا ہے۔ انسان اپنی جون میں کب واپس آئے گا۔

تاریخیت و نو تاریخیت:

ڈاکٹر ناہید قمر تاریخیت اور نو تاریخیت کی وضاحت کے بعد اردو ناولوں "آنگن"، "بستی"، "تذکرہ"، "آگے سمندر ہے"، "اداس نسلیں"، "نادار لوگ"، "خوشیوں کا باغ"، "جنم کنڈلی"، "راجہ گدھ"، "بہاؤ"، "اے غزال شب"، راکھ"، "خس و خاشاک زمانے میں"، "غلام باغ"، "جاگے ہیں خواب میں" کو اسی تناظر میں دیکھتی ہیں۔ نورالحسنین "اردو ناول کی ایک صدی" تاریخی ناولوں کے ذیل میں "آگ کا دریا" اور نورالحسنین کے "ایوانوں کے خوابیدہ چراغ" کا ذکر تاریخیت کے حوالے سے یوں کرتے ہیں:

> "بہت دنوں کے بعد تاریخی ناول خالد بن ولید کی صورت میں سامنے آیا۔ جہاں صورت حال کو صورت حال واضح نہیں کرتی تھی، الفاظ کا شکوہ واضح کرتا تھا۔ قاضی عبدالستار کی جادوگری کا میں قائل ہو گیا۔ مگر ظاہر ہے جادو کے اثر کو کبھی نہ کبھی زائل ہونا ہی تھا سو وہ اثر بالآخر رفع دفع ہو گیا۔ (جب کہ شب گزیدہ کا اثر باقی رہ گیا) البتہ 'آگ کا دریا' اور 'کئی چاند تھے سر آسماں' کی سحر کاری شاید کچھ الگ نوعیت کی ہے۔ میں بالعموم 'تراشیدم، پرستیدم، شکستم' کا قائل ہوں۔ یہ دونوں ایسی خاک آتش دیدہ کا نمونہ ہیں کہ بار بار کی اٹھا پٹخ کے بعد بھی یہ ٹوٹے ناہیں ٹوٹتے۔ ان دونوں میں جہاں تک 'آگ کا دریا' کا معاملہ ہے وہاں تاریخ سے زیادہ تاریخیت ہے اور 'کئی چاند تھے سر آسماں' میں تاریخیت سے زیادہ تاریخ ہے مگر تخلیقی بصیرت کے ساتھ۔ نورالحسنین کا نیا ناول اپنے عنوان کے لحاظ سے تاریخیت، تاریخی شعور، وہ تخلیقی شعور تمام اوصاف کی طرف اشارے کرتا ہے۔ اپنی ابتداء سے آخر تک نورالحسنین ایک کامیاب قصہ گو کی طرح قاری کو اپنے قصے سے باندھے رکھتے ہیں۔"[۸۱]

جدیدیت:

ڈاکٹر سلیم اختر ناول "بستی کو جدید ناول کا نکتہ آغاز کہتے ہیں کیوں کہ بستی کی وجہ سے ناول جدید دور میں داخل ہوا ہے۔ اس ناول میں روایت سے ہٹ کر نہ تو واضح اور دوٹوک قسم کی کردار نگاری ملتی ہے اور نہ کہانی۔ انتظار حسین اس ناول میں خارجی زندگی پر باطنیت کے حوالے سے روشنی ڈالتے ہیں۔ مضمون نگار ناول

میں استعمال کیے گئے علامتوں کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔ مظہر الزماں خاں کی "نئی الف لیلی" کے متعلق مشرف عالم ذوقی لکھتے ہیں کہ "وہ برسوں سے جدیدیت کے جس خول میں گرفتار تھے، اس میں آج بھی نظر بند ہیں جب کہ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جدیدیت اب گزرے زمانے کا قصہ ہیں" (۸۲) جدیدیت اور ترقی پسند نثر کے امتزاج کے حامل نثر نگار رحمٰن عباس کا ناول "ایک ممنوعہ محبت کی کہانی" (۲۰۰۰ء) میں مسلم گھرانوں کے ثقافتی، خانگی اور تہذیبی رویوں کو بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے حساب سے شرعی زندگی گزار رہے ہیں اور نئی روشنی سے استفادے کے لیے تیار نہیں۔ نور الحسنین جدیدیت کے حوالے سے ناول "خوشیوں کا باغ"، "مظہر الزماں کے "آخری زمین" شفق کے "کانچ کے بازی گر" اور سلیم شہزاد کے "دشت آدم" کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ:

> "جدیدیت کے دور میں بھی ناول لکھے گئے اگرچہ ان کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے کے لائق ہیں، لیکن تب بھی کہیں خوشیوں کا باغ کھلا، تو مظہر الزماں نے "آخری زمین" کی پیش گوئی کی۔ فلسفہ اور منطق کے اسرار سے قاری کو جکڑ لیا۔ تو شفق نے کانچ کے بازی گروں کو اپنا نشانہ بنایا۔ اور سلیم شہزاد نے دشت آدم میں نظم اور نثر کے اختلاط سے ایک نیا اسلوب دریافت کیا" (۸۳)

انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ" جدید شہری زندگی کے تضادات کی پیشکش پر مبنی ہے۔ سیاسی، سماجی اور مذہبی جبر کے بیانیہ میں ناول نگار، کرداروں کے ذریعے اپنے محسوسات بیان کرتا ہے۔ ظاہری خوش حالی کے باوجود، خارجی صورت حال کی وجہ سے روح میں گھٹن محسوس کرتا ہے اور بیگانگی ذات کا شکار ہو کر اکیلا رہ جاتا ہے۔ ناول نگار عصری صورت حال کی عکاسی کے لیے ہالینڈ کے مصور ہائر انیمس بوش کی تصاویر (جس میں زمین کے موجودہ جہنم کی نقشہ کشی کی ہے) کا استعمال کرتا ہے۔ ناول نگار عصری صورت حال کی وجہ سے تیسری دنیا کو انسان کا جہنم قرار دیتے ہیں جب کہ دوسرے ناول "جنم روپ" میں شاعرانہ اسلوب اور استعاراتی زبان اور فینٹاسی کی تکنیک کی مدد سے مردانہ سماج میں خواتین کے جذباتی اور فکری گھٹن کو موضوع بناتے ہیں۔ انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے" کا پروفیسر دراصل خود انیس ناگی کی اپنی ذات ہے جو کہ ایک بیوروکریٹ کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ سچ بولنے والے کے ساتھ معاشرے کا طرز عمل اور عدالتی نظام کی تباہی کی خوبصورت عکاسی ناول میں ملتی ہے۔ ناول میں شخصی اور انفرادی کہانی کو ملکی تاریخ کے ساتھ جوڑ کر ایک سے زیادہ سطحیں پیدا کی گئی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناول "گردش رنگ چمن" اور "چاندنی بیگم" کا ذکر بھی

جدیدیت کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ دراصل انسانی زندگی پر باطنی حوالے سے روشنی ڈالنا جدیدیت کا موضوع ہے۔ فرد کی بیگانگی، تنہائی اور لاچارگی یہ سارے حوالے گردش رنگ چمن میں موجود ہے۔ "چاندنی بیگم" بھی فرد کے باطن کو موضوع بناتا ہے۔ اس ناول میں چاندنی بیگم کہانی کے ابتدائی حصے میں ہی مر جاتی ہے لیکن پورے ناول میں اس کی موجودگی محسوس ہوتی ہے۔ فاروق خالد کے ناول "سیاہ آئینے" اقدار کی شکست وریخت کے نتیجے میں نفسیاتی کشمکش کا شکار معاشرے کی کہانی ہے۔ ناول کے ابنارمل کرداروں کے ذریعے یہ دکھایا گیا ہے کہ معاشرے کا ظاہر و باطن کس قدر تاریک ہو چکا ہے۔ تخلیق کیے گئے ماحول نے ناول کے قصے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ناول "جنم کنڈلی" دو اہم کرداروں کے داخلی احساسات اور ان کے خارج میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق ناول "جنم کنڈلی کا کردار "وہ" خود کو ایک ایسے دھڑ میں پاتا ہے جس میں خوف، بے اعتمادی، بے یقینی، شک، غیر مقبولیت وغیرہ بہت سے عناصر موجود ہیں"[۸۴] زاہد حسن "ناول میں انسانی باطن کا اظہار" کے عنوان سے اردو ناول کا بین الاقوامی ناول کے تناظر میں اور قدیم و جدید اردو ناول میں انسانی باطنی مسائل کے حوالے سے مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ مضمون کے مطابق دنیا فکشن اور فکشن دنیا کے پیچھے دیوانی نظر آتی ہے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس عہد کے انسان کو ماضی اور ماضی میں موجود زمانے کی حقیقی اور ہو بہ ہو صورت میں اپنے وجود کی تلاش ہے جو کہ قصے کہانی خاص طور پر ناول کی صورت میں ممکن نظر آتا ہے۔ زاہد حسن اسی تناظر میں مستنصر حسین تارڑ کے ناول "منطق الطیر جدید" اختر رضا سلیمی کے "جندر" رفاقت حیات کے "میر واہ کی راتیں" سید کاشف رضا کے ناول "چار درویش اور ایک کچھوا" آمنہ مفتی کے "پانی مر رہا ہے" محمد عامر رانا کے "سائے" اور آزاد مہدی کے ناول "ایک دن کی زندگی" کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش کے مضمون کے مطابق ناول کے توسط سے ناول نگار اپنے کچھ عزیز نظریات یا کسی بیانیے کی ترسیل کرتا ہے جسے کسی مخصوص سیاسی، سماجی، ثقافتی، نسلی یا لسانی گروہ کی پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس بیانیے سے گریز کرنے والا ناول میں مشکلات، مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے۔ یوں ایسے ہر ناول کی بنیاد کسی بڑے بیانے کے استحکام کے ساتھ ساتھ عصبیت پر ہوتی ہے۔ جدیدیت جس نے جمہوری اقدار کو فروغ دینا تھا۔ سیاسی، مذہبی، قومی، نسلی، ثقافتی بنیادوں پر مبنی بیانیے کو کم کر کے ختم کرنے کی بجائے قدیمیت کو ہی فروغ دیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے ناولوں میں جدیدیت کے نام پر انہی بڑے بیانے پر مبنی ہے۔ مضمون کے

مطابق " توبتہ النصوح"، "آگ کا دریا"، "راکھ"، "جب کھیت جاگے"، "زمین کے رشتے" اور " دھندلے کوس" نے جدیدیت کے نام پر قدیمیت کو ہی فروغ دیا۔

مابعد جدیدیت:

ڈاکٹر صلاح الدین درویش کے مضمون کے مطابق جب جدیدیت کے ذریعے جمہوری اقدار کی تشکیل نہ ہو سکی تو ازالے کے طور پر مابعد جدیدیت سامنے آئی کیوں کہ مابعد جدیدیت کے زیر اثر اجتماعیت کی عصبیت پر مبنی بیانیوں کی رد تشکیل کر کے اس جبریت کو توڑا جا سکتا ہے۔ مختصراً ان بیانیوں کے رد تشکیل سے ذاتی، شخصی، اور نجی معاملات کو فکری، تخلیقی اور پیداواری حوالوں سے آزادی دی جا سکتی ہے۔ اردو میں چند ناول ایسے بھی ہے جن میں ان بڑے بیانیوں کی رد تشکیل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مثلاً پریم چند کے ناول "بیوہ" میں بیواؤں کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے لالہ امرت کا بدھوا آشرم بنانا جبکہ ہندو دھرم میں ایسے کسی آشرم کی گنجائش نہیں۔ خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" میں مسلم لیگ کے مذہبی بیانیے کی رد تشکیل ہے جس کی بنیاد پر ہندوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں خنجر تھما دیے گئے۔ کرشن چندر کے ناول "پہلا پتھر" میں گورے اور رنگ دار نسل کے بیانیے کی رد تشکیل انگریز ماڈل جولی اور ہندوستانی ڈاکٹر کنول پرساد کے کرداروں کے ذریعے کی گئی ہے۔ قراۃ العین حیدر کے "گردش رنگ چمن" میں مسلم کلچر کے مردانہ برتری کے بیانیے کی رد تشکیل طوائفوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ جبکہ مستنصر حسین تارڑ کے "خس و خاشاک زمانے" میں ذات برادری، قومیت، وطنیت، نسلیت، مذہب اور ثقافت تمام بڑے بیانیوں کی رد تشکیل حرام کے نطفے کی پیداوار مرد اور سانسی قبیلے کی لڑکی کے ذریعے کی گئی ہے۔ جن کی متمدن اور مہذب دنیا میں کوئی شناخت نہیں اور ایسے کرداروں سے انسیت اس قسم کے ناولوں کی مدد سے ہی پیدا کی جا سکتی ہے ایسے ہی ناول ہمیں نمائشی اقدار سے نکلنے میں مدد کر سکتے ہیں۔ انیس اشفاق "معاصر اردو ناول: نئے تنقیدی تناظر (ہندوستانی ناول نگاروں کے حوالے سے)" میں اردو ناولوں پر مابعد جدیدیت کے حوالے سے یوں بحث کرتے ہیں کہ جب جدیدیت کے ترجیحی اور مخصوص موضوعات کی تکرار نے بعض دائمی اور آفاقی موضوعات کو منظر نامے سے ہٹا دیا تو پھر ان موضوعات کی تجدید اور مسائل کی ایک نئی دنیا سے آگاہی نے ادبی منظر نامے کو بدلنا شروع کر دیا اور اس نئے ادب کو مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا۔ اس نئے ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے حوالے سے انیس اشفاق، پروفیسر نارنگ کے درج ذیل دو اقتباسات کا حوالہ دیتے ہیں:

"نئی ادبی فکر کی رو سے متن خود مختار اور خود کفیل نہیں ہے یا یہ کہ معنی متن میں بلقوۃ موجود ہوتا ہے۔ قاری اور قرات کا عمل اسے بالفعل موجود بتاتا ہے یا یہ کہ معنی وحدانی نہیں ہے یہ تفریقی رشتوں سے پیدا ہوتا ہے اور جتنا ظاہر ہے اتنا غیاب میں بھی ہے یا یہ کہ متن چوں کہ آئیڈیالوجی کی تشکیل ہے اس لیے ادب کی کسی بحث سے تاریخی، سیاسی، سماجی یا ثقافتی معنی کا اخراج نہ صرف غلط بل کہ گمراہ کن ہے۔۔۔ نئی تنقید ایک تخفیف شدہ کائنات کی تنقید ہو کر رہ گئی جس کا رشتہ زندگی کے حرکیاتی ڈسکورس سے کٹ گیا۔ گھوم پھر کر یہ تنقید ذات کے داخلی منظر نامے کو اجاگر کرتی ہے۔ نہ کہ حیات اور کائنات کے تمام تر منظر نامے کو۔"(۸۵)

بیسویں صدی تک آتے آتے وسیع ہوتی دنیا کے خارجی مسائل اگرچہ ہماری سائیکی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں تاہم کیفیات کے لحاظ سے تنہائی، لایعنیت، رائیگانی، معدومیت یا مہملیت جیسی ذہنی حالتوں سے دوچار کر کے اپنی ذات میں سمٹنے پر مجبور نہیں کرتے بل کہ ان مسائل کے درمیان ہم اپنے وجود کے انکار کی بجائے اثبات و قیام کی جنگ لڑتے ہیں۔ یوں ناولوں میں ان موضوعات کی پیش کش کے حوالے سے مقالہ نگار "دو گز زمین"، "مکان"، "پانی"، "فرات"، "ندی"، "کینچلی"، "کہانی انکل"، "گیان سنگھ شاطر"، "فائر ایریا"، "پھول جیسے لوگ"، "تین بتی کے راما"، "آخری داستان گو"، "نمبر دار کا نیلا"، "بیان"، "کسی دن"، "نمک"، "دویہ بانی"، "ذبح" اور "بساط" کی نشاندہی کرتا ہے اور اس فہرست میں سے کچھ ناولوں جیسے "دو گز زمین"، "مکان"، "فائر ایریا"، "نمبر دار کا نیلا"، "کسی دن"، "بساط"، ذبح"، "فرات"، "نمک"، "ندی"، "کینچلی"، "پانی سے لے کر مم" اور "گیان سنگھ شاطر" کے ذریعے اپنے بحث کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ محمد حمید شاہد کے مطابق مرزا اطہر بیگ کے ناول "غلام باغ" نے مابعد جدید ناول کے طور پر بہت داد پائی۔ "صفر سے ایک تک" اور "حسن کی صورت حال" کو بھی نئی تنقید والوں کی طرف سے پسندیدگی کی سند حاصل ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی کے مطابق "غلام باغ" مابعد جدیدیت کے تناظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ اس ناول سے متعلق عبد اللہ حسین کے اقتباس کا حوالہ دیا گیا ہے کہ "اپنے مقام میں اردو ناول کی روایت سے قطعی ہٹ کے واقع ہے بل کہ انگریزی ناول میں بھی یہ تکنیک ناپید ہے۔ اس کے ڈانڈے یورپی ناول خاص طور پر فرانسیسی پوسٹ ماڈرن ناول سے ملتے ہیں"(۸۶)۔ ناول "غلام باغ" اجتہادی صورت میں انسان کے زمانہ قدیم کے مسائل نفس پرستی، ہوس زر، انسان دشمنی، حقارت، نفرت، انتقام، استحصال، جادو اور

زن،زر،زمین کے تنازعے کے گرد گھومتا ہے۔ناول نگار ان رزائل کو سچ ، جھوٹ ، گناہ اور ثواب کے خانے میں رکھتا ہے نہ ان سے نفرت کرتا ہے اور نہ ہی بغاوت بلکہ غیر جانبدار رہ کر ان مسائل کو انسان کے موت کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔فضائل اور رزائل کی اس بحث کے لیے ناول نگار نطشے کی موضوعی منفیت(Nihilsism)جب کہ زندگی کو کامیو کی لغویاتی منہاج سے پرکھتے ہیں۔ تین ابواب پر مشتمل اصغر ندیم سید کا ناول "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر "مابعد جدید تکنیکس (کہانی در کہانی، قصہ گوئی، بیت المتنیت، کثرت پسندی) کے استعمال سے ایک جدید ناول کی تعریف پر پورا اترتا ہے جس میں کسی ایک قصے کو مرکزیت حاصل نہیں بلکہ مختلف چھوٹے چھوٹے قصوں، روایتوں اور حقایتوں کو جوڑ کر ایک شہر کی تاریخ کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق:

> "سیاست، نفسیات، جنس، قتل، موت اور خون ریزی کے مناظر شعوری اور غیر شعوری طور پر معاصر زندگی کی شکستگی، بے ربطی اور ٹوٹ پھوٹ کا اظہار کرتے ہیں۔ مرکزی کردار اپنے شہر کی طرح زوال آمادہ ہوتا اور بالآخر فنا کا سفر اختیار کرلیتا ہے اور اپنے پیچھے کئی لایعنی سوال اور ان کے ممکنہ جوابات کے درست ہونے یا نہ ہونے کی الجھن چھوڑ جاتا ہے۔"(۸۷)

لایعنی سوالات جوابات کے درست ہونے نہ ہونے کی الجھن یہ سارے حربے جدید ناول کے ہیں جو کہ معاصر زندگی کے غیر یقینی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔

ماحولیات:

یوسف نون کے مطابق مستنصر حسین تارڑ کے ناول "بہاؤ" کو وادی ہاکڑہ کی پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب کے ساتھ ساتھ اس وادی کے کرہ حیات، ماحولیات یا فطرت کی موت کا نوحہ بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ دریا کے خشک ہونے سے تہذیب ہی نہیں بلکہ اس سے منسلک تمام کرہ حیات کو بھی شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔یوں تہذیبی خاتمے کے قصے میں ماحولیاتی مقامیت بھی تارڑ کے پلاٹ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مضمون نگار اس ناول پر اکالوجی کے تناظر میں بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "مصنف اس ناول کے پلاٹ کو بشر مرکزیت(Anthro pocentrism)دائروں میں چلاتے ہوئے بن نگاری(Wilderness Writing)سے کام لیتے ہوئے راعیانہ ادب(Postoral)کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں"(۸۸)۔ اپنے بیان کو موثر بنانے کے لیے کئی ماحولیاتی ادبی ہائے طریقہ کار جیسے سماجی ماحولیات اور ماحولیاتی مارکسیت، ماحولیاتی

تانیثیت،ماحولیاتی مابعد نو آبادیات،بن نگاری،راعیانیت،مظاہر پسندی اور منظر نگاری سے کام لیتے ہیں۔ مضمون میں انہی ماحولیاتی ادبی ہائے طریقہ کار کے مطابق ناول پر بحث کی گئی ہے۔

طریقہ کار کے لحاظ سے:

تاریخ:

انتظار حسین کے ناول تاریخی المیوں سے جنم لیتے ہیں۔ناول "چاند گہن" میں ۱۹۴۷ء کے حالات و واقعات یعنی طلوع پاکستان کی عکاسی پروفیسر سبطین اور کالے خان جیسے کرداروں کے ذریعے کی گئی ہے۔"تذکرہ "مہاجروں کے مسائل کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھاتا ہے کہ تکلیف کی گھڑیاں دن اور راتیں بہت لمبی ہوتی ہیں۔" آگے سمندر ہے "کا موضوع کراچی کی دہشت گردی ہے۔دن دیہاڑے وارداتیں اور بوری بند لاشوں کا ملنا معمول بن گیا تھا جب کہ "بستی "کا موضوع ہجرت، قیام پاکستان کے وقت حالات اور ایسے حالات میں لاہور شہر میں بسنے کی کیفیت کی عکاسی مرکزی کردار ذاکر صورت میں کی گئی ہے۔یوں انتظار حسین اپنے ناولوں میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، ہجرت،۱۹۴۷ء کے حالات و واقعات اور ۱۹۷۱ء کے وقت کہ جب ہر طرف افراتفری اور عوام میں بے چینی تھی کو بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں جب کہ نبیل مشتاق کے مطابق انتظار حسین تیرہ صدیوں کی تاریخ کو اپنے ناول "بستی "کا حصہ یوں بناتے ہیں:

> "انہوں نے مسلمانوں کی ہندوستان میں بحیثیت فاتحین آمد، ہندوستان میں مسلمانوں کے طرز حکمرانی مسلمانوں کی تخت نشینی کے لیے آپسی جنگوں، انگریز استعمار اور سامراجی حکومت کے قیام، انگریز حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے آغاز اور انجام، مسلمانوں اور ہندوؤں میں باہمی انتشار کی فضا، ہندوؤں کی طرف سے انگریزوں اور مسلمانوں کے لیے ہندوستان چھوڑ دو نعرہ، مسلمانوں کی قیام پاکستان کے لیے سیاسی جدوجہد اور کامیابی، تقسیم ہند اور ہجرت کے خونیں واقعات، ہجرت کے بعد پاکستان میں طمع و لالچ کی فضا کا عروج، پاکستان میں سرمایہ دار اور استعماری طاقتوں کے گھناؤنے کھیل، پاکستان اور ہندوستان کے مابین جنگی ماحول، مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں میں اقتدار کی ہوس، اپنوں اور غیروں کی سازشیں اور سانحہ مشرقی پاکستان تک کے تاریخی واقعات کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔"(۸۹)

ناول "اداس نسلیں" میں جہاں اپنوں اور غیروں کے چہرے سامنے آتے ہیں وہیں تاریخ کے تاریک پہلوؤں سے بھی پردے اٹھاتا ہے مثلاً جلیانوالہ والا باغ کا واقعہ بھی تاریخ کا ایک ایسا ہی تاریک پہلو ہے جس کا ذکر اس ناول میں ملتا ہے۔ ادب کے تناظر میں لکھا جانے والا تاریخی ناول "نادار لوگ" ۱۹۴۷ء کے بعد کے پاکستان کے حالات و واقعات پر مبنی ہے اور مشرقی پاکستان میں ہونے والے سانحات سے متعلق محمود الرحمٰن کی رپورٹ اس ناول کے تخلیق کی وجہ بنی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی تاریخی ناولوں کے اصولوں کی روشنی میں عبد الحلیم شرر کے ناولوں "زوال بغداد"، "ایام عرب"، "فردوس بریں" اور "جویائے حق" کا جائزہ لینے کے بعد داد تحسین دیتے ہیں نیز ان کے مضمون کے مطابق عزیز احمد نے دونوں ناولٹ "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" اور " خدنگ جستہ "میں تاریخی ناولوں کے فنی نزاکتوں کو عمدگی سے برتا ہے جب کہ بیسویں صدی میں تاریخی ناولوں کی کمی قاضی عبد الستار "صلاح الدین ایوبی"، "دار الشکوہ"، عصمت چغتائی "ایک قطرہ خون" یعقوب یاور "دل من" اور "عزازیل" اور سلیم شہزاد "ویر گاتھا" لکھ کر پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرزا غالب کے ساتھ اپنے ذہنی اشتراک کو منٹو نے اپنی تحریروں میں تو ظاہر کیا ہے لیکن اس اشتراک سے متعلق کوئی مستند کتاب موجود نہیں۔ تاہم بنگالی رابی شنکر پال "دوزخ نامہ" کے عنوان سے بعد از مرگ دوزخ کے مقام پر غالب اور منٹو کا مکالمہ رقم کرتے ہیں جس میں ان دونوں کے کرب اور سماج کی تمام تر تلخی جو کہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتی تھی کی عمدہ عکاسی ملتی ہے۔ ناول کا پلاٹ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ کے فسادات سے جنم لینے والے اجتماعی آشوب پر مبنی ہے۔ ناول میں کرداروں کی پیش کش میں طلسمی حقیقت نگاری کی تکنیک سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق جلد ہی معروف شاعر انعام نعیم کے ترجمے کے ذریعے سے اردو دنیا اس ناول سے محظوظ ہو سکے گی۔ دردانہ نوشین خان کے مطابق "ناول اگر زندہ رہ جائے تو آنے والی نسلوں اور زمانوں کے لیے وہ تاریخ کا ایک ٹکڑا ہے۔"[۹۰] اس مضمون میں ایسے ہی زندہ تاریخی ناولوں کی فہرست میں "خدا کی بستی"، "امراؤ جان ادا"، "چوگان ہستی"، "بیوہ"، "بازار حسن"، "گوشہ عافیت"، "گؤدان"، "آنگن"، "آگ کا دریا"، "اداس نسلیں"، "دروازہ کھلتا ہے"، "کئی چاند تھے سر آسماں"، "علی پور کا ایلی"، "نولکھی کوٹھی"، "قبض زمان"، "دشت سوس"، "تنہا"، "لہو رنگ فلسطین"، "قربت مرگ میں محبت"، "محبت"، "راکھ"، "دشت وفا"، "بیلہ" اور "راجہ گدھ" پر بحث ملتی ہے۔ رشید رضویہ کا ناول "گھر میرا رستے غم کے" اساطیری عہد سے لے کر جدید دور کے بغداد کی روداد ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا

ناول "چہرہ بہ چہرہ روبرو" قراۃ العین طاہرہ کے متنازعہ اور تاریخی شخصیت کے عہد کی تصویر کشی پر مبنی ہے۔ سید محمد اشرف کے ناول "آخری سواریاں" کے متعلق مشرف عالم ذوقی لکھتے ہیں:

"سید محمد اشرف نے نہ صرف ہماری تہذیب کا نوحہ بیان کیا بلکہ بہادر شاہ ظفر، شاہی دستر خوان، سلطنت مغلیہ کے عروج و داستان کی داستان کو نرم لہجے میں اس طرح بیان کیا کہ ہر صفحے پر صدیاں سمٹ آئیں اور سواریوں کا رخصت ہونا تہذیبوں کے تصادم اور زوال کی علامت بن گیا۔"(۹۱)

یوں سواریوں کے لٹنے سے نئی سواریاں آتی جاتی ہیں اور یہ کھیل جاری رہتا ہے۔ گزشتہ لکھنؤ پر مبنی انیس اشفاق کا ناول "دکھیارے" ماضی اور حال کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اختر رضا سلیمی کا ناول "جاگے ہیں خواب میں" فلسفہ زماں و مکاں، اجتماعی شعور و لاشعور، مستقبل کے جائزے کے ساتھ تاریخ کے سات سمندروں کی تلاش پر بھی مبنی ہے۔ نورالحسنین غدر کے واقعات کو احساسات کی زبان دے کر ناول "ایوانوں کے خوابیدہ چراغ" کی صورت میں ادب کا حصہ بناتے ہیں جب کہ مصطفی کریم اپنے تاریخی ناول "طوفان کی آہٹ" میں سراج الدولہ کی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر کا ناول "فردوس بریں" پانچویں صدی ہجری میں دنیائے اسلام کے لیے فتنہ بن کر سامنے آنے والے فرقہ باطنیہ کی سازشوں کا احاطہ کرتا ہے۔ خورشید ربانی، شمس الرحمان فاروقی کے "کئی چاند سرے آسماں" اور مرزا اطہر بیگ کے "غلام باغ" کے درمیان اشتراک کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"دونوں ناولوں میں جو بات مشترک ہے وہ یہ کہ یہ تاریخی اعتبار سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں یعنی "کئی چاند تھے سرے آسماں" تاریخی طور پر جہاں ختم ہوتا ہے "غلام باغ" وہیں سے اپنا سفر شروع کرتا ہے"(۹۲)

باغ زندگی کی جب کہ غلام اسیری کی علامت ہے اگر آزاد انسان کو غلام بنایا جایا تو جانوروں سے بھی بدتر حشر ہو جاتا ہے۔ ناول میں آج کے بظاہر آزاد انسان جب کہ یہ باطن نفس اور استعمار کے ہاتھوں غلام انسان کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ عزیز احمد ناول "آگ" میں کشمیر کی صورتحال کو تاریخی تناظر میں انسانی عمل کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ محمد عاطف علیم کے مطابق

"انہوں نے اس ناول میں کشمیر کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتحال کو ہندوستان کی مجموعی صورتحال کے تناظر میں لکھا ہے۔ یہ ناول ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۲ء کے درمیانی

عرصے کا احاطہ کرتا ہے۔یہی وہ عرصہ ہے جو کشمیر کی سیاسی تاریخ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔کشمیر کی غلامی اور کشمیریوں کے خلاف ہونے والی ننگی جارحیت کے تمام تانے بانے اسی دور کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔"(۹۳)

ناول "آگ کا دریا" میں مصنفہ ورجینا اولف کے "آرلینڈو" میں برتے گئے اشارتی انداز سے استفادہ کرکے ہندوستان کے اڑھائی ہزار سال کے سیاسی اور تہذیبی تاریخ کے ساتھ ہر عہد کے روح کی عمدہ عکاسی چند کرداروں کی صورت میں کرتی ہیں۔ہری شنکر بدھ فلسفہ کا نمائندہ، گوتم نیلمبر ایک متلاشی روح ہے اور یہ سلسلہ ناول کے آخر تک چلتا رہتا ہے۔چمپک ہندوستانی عورت کا اشارہ جو کہ چمپک سے چمپا اور آخر میں چمپا احمد بن جاتی ہیں۔ابوالمنصور کمال الدین مسلم تہذیب کا نمائندہ ہے جس کی آمد کے ساتھ مسلم عہد شروع ہوتا ہے۔مختلف مسلمان بادشاہوں کے بعد واجد علی شاہ، کانگریس، مسلم لیگ، جدید لکھنؤ، اور انگریزوں کا عہد آتا ہے۔احسن فاروقی ناول "سنگم" میں "آگ کا دریا" کے ساختی تجربے کے طرز پر برصغیر کے نوسو سالہ تاریخ کو تخلیقی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ فیصل ریحان کے مضمون کے مطابق بلوچستان میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۸ء تک کے قیام کے دوران نسیم حجازی نے تین ناول "محمد بن قاسم"، "شاہین" اور "آخری چٹان" لکھے۔ان کے ناولوں میں ممتاز اسلامی تاریخی کرداروں کے تناظر میں نوجوانوں میں جذبہ جہاد ابھارنے کی کوشش بڑی صاف نظر آتی ہے۔ان کے ناولوں میں صحرائی ماحول کی عکاسی میں بلوچستان کے صحرائی مناظر کا عکاسی ملتی ہے۔سعد اللہ جان برق ناول "شب چراغ" میں شب چراغ کی علامت کو باچا خان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔مختلف کرداروں کی مدد سے کہانی بڑھاتے ہوئے جب باچا خان تک پہنچتے ہیں تو پلاٹ میں واقعات کی بجائے باچا خان کی تعلیمات اور فلسفے کو مؤرخ کی طرز پر بتانا شروع کرتے ہیں نیز افغانستان کے تاریخی واقعات پر بحث اس ناول کی تاریخی اہمیت کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔ڈاکٹر سید زبیر شاہ کے مطابق:

"مصنف نے پختونوں کے زوال، خانہ جنگی، تعلیم سے دوری اور شدت پسندی کو باچا خان کے نظریہ امن، نظریہ تعلیم اور عدم تشدد کی مدد سے ختم کرنے کی کوششوں کو کاغذ پر کہانی کی شکل میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔سیاست میں مذہب کا استعمال اس خطے کا بڑا المیہ رہا ہے لیکن اس ناول میں دین کی خدمت کرنے والے ان نام نہادوں کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی گئی ہے جو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں۔"(۹۴)

جب کہ زیف سید نے " آدھی رات کا سورج " میں اسپین اور اندلس کے عروج و زوال کی کہانی کو سفر نامے کی تکنیک میں پیش کر کے بعض تاریخی اغلاط کی تصحیح کی کوشش کی ہے۔ناول میں اندلس کی تہذیب و ثقافت، زبان اور فنون لطیفہ پر مسلمانوں کے مرتب شدہ اثرات کو مدلل انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ مرزا حامد بیگ کے ناول " انار کلی" میں شہزادہ سلیم اور انار کلی کے داستان عشق کی از سر نو بازیافت کی گئی ہے۔ ناول کے مطابق مورخین نے انار کلی کے موت کا سبب درست نہیں بتایا جب کہ حقیقت میں انار کلی کی موت زنا بالمحرمات کے مقدمے کے نتیجے میں ہوئی جسے سب سے چھپایا گیا۔ اپنی بات کی تصدیق کے لیے وہ دربار اکبری کے شاعر عرفی شیرازی کے اشعار کے حوالے دیتے ہیں۔ تین نسلوں کی کہانی پر مبنی مستنصر حسین تارڑ کا ناول "خس و خاشاک زمانے میں "۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک کے ہمارے سماجی و ثقافتی تاریخ پر مبنی ہونے کے ساتھ ہجرت اور قیام بنگلہ دیش کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ تاریخ کا نوحہ کہلایا جانے والا خالدہ حسین کا ناول "کاغذی گھاٹ" مشرقی پاکستان کے تمام تر تلخ حقائق کو موضوع بنائے ہوئے ہے۔ حفیظ خان کے ناول " ادھ ادھورے لوگ " اور " انواسی " سرائیکی بیلٹ کے تاریخی و ثقافتی نقوش پر مبنی ہونے کے ساتھ نو آبادیاتی زندگی میں یہاں کے مکینوں کے صورت حال کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ ناول نگار نے استعماری ذہن کے استحصالی صورتوں کے مقابلے میں یہاں کی مقامیت کے اظہار پر خاص توجہ مرکوز کی ہوئی ہے۔ اصغر ندیم سید ناول "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر " میں قدیم تاریخی شہر ملتان کے مختلف تاریخی پہلوؤں کو چھوٹے چھوٹے قصوں، روایتوں اور حکایتوں کو جوڑ کر بیان کرتے ہیں۔ یہ ناول سیاست، نفسیات، جنس، قتل ، خون ریزی ، شعوری و لاشعوری معاصر زندگی کی شکستگیوں پر مبنی ہے۔ معاصر تاریخ کو موضوع بناتا اکرام بریلوی کا ناول "حسرت تعمیر" گزشتہ چالیس سال سے عالمی طاقتوں کی کشمکش اور ان کی تخریبی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہمارے خطے کے مسائل کو موضوع بناتا ہے۔ خالد محمد فتح کا ناول " خلیج" مشرقی پاکستان کے ہم سے الگ ہونے کے واقعات، تاریخی و جغرافیائی عوامل، سیاسی ریشہ دوانیوں ، عوام کے جذبات ، احساسات، حالات، بیرونی مداخلت اور اپنی غلطیوں کو موضوع بناتا ہے جب کہ دوسرا ناول "شہر مدفون " پانچ نسلوں کی کہانی پر مبنی ہے۔ ناول کے مطابق مہارانا کے فوج کے سپاہی بوچہ مل کے دوسری اور تیسری نسلیں معاشی طور پر مستحکم ہیں تیسری نسل تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہو کر بھی آسودہ زندگی گزارتی ہے جبکہ چوتھی اور پانچویں نسل تعلیم یافتہ اور مہذب بن چکی ہے۔ تاریخی شعور کے حامل اس ناول میں تاریخ کو اس طور متن کا حصہ بنایا گیا ہے کہ تشکیل متن کے ساتھ تشکیل حقیقت کا کام بھی لیا گیا ہے جب کہ ناول "سانپ سے زیادہ سیر اب " میں ساٹھ

سے ستر کی دہائی کے پاکستان کو موضوع بناتے ہیں۔اس دور کی تہذیب میں آج کے پاکستان کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ محمد حمید شاہد ناول "مٹی آدم کھاتی ہے"میں مشرقی پاکستان کے المیے کو ہمارے تہذیبی زندگی کے دائرے میں پیش کرتے ہیں۔شاہد رضوان نے ناول "گنجی بار" میں احمد خان کھرل کی شخصیت کو موضوع بنایا ہے جس نے ۱۸۵۷ء میں ساہیوال کے علاقے میں انگریزوں کے حلاف محاذ بنا کر شدید زک پہنچایا تھاسیاسی تناظر پر مبنی اس ناول میں مذکورہ دور کے ثقافتی، سماجی اور جنسی رویوں کو بھی برتا گیا ہے۔ناول "نیلی بار" میں طاہرہ اقبال ۱۹۴۷ سے لے کر آج تک کے پاکستان کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کو موضوع بناتی ہیں۔ مصنفہ اس ناول میں غیر انسانی رویوں، سیاسی، اقتصادی و معاشرتی ابتری اور نظام زر کی غیر منصفانہ تقسیم کو جاری رکھنے والے استحصالی نظام کی عکاسی کے ساتھ، ہمارے سماجی ڈھانچے کے دھتکارے اور استحصال زدہ لوگ کو ہیروز بناتی ہیں۔یوں طاہرہ اقبال ہماری تاریخ کے دکھوں، ذلتوں اور خونیں داستان کو نیلی بار کی بساط پر سمیٹتی ہیں۔

ترقی پسندیت :

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والے سجاد ظہیر کے ناول "لندن کی ایک رات" کو پہلا باقاعدہ مارکسی اور اشتراکی ناول قرار دیا گیا ہے۔برطانوی تمدن میں زیست کرتے ان کے کردار ہندوستانی طلبہ پر مشتمل ہیں۔جن کی گفتگو کا مرکز ہندوستان کی غربت، لاچاری اور غلامی ہے۔کرداروں کی گفتگو سماجی اور اشتراکی فلسفے کا شعور دیتی ہیں۔کرشن چندر رومانوی اور اشتراکی حقیقت نگاری کے ذیل میں انسان دوستی اور طبقاتی کشمکش کو ناول "شکست" میں پیش کرتے ہیں۔ناول کا کردار شیام اپنے سے کم تر ذات کی لڑکی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے لڑکی اس کی محبت میں سماج سے ٹکرا جاتی ہے لیکن شکست دونوں کا مقدر بن جاتا ہے یوں ناول کے مطابق نوجوان طبقہ صدیوں سے رائج غیر انسانی سماجی نظام کو چاہنے کے باوجود بھی بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔جب کہ طنز و مزاح پر مبنی ان کا دوسرا ناول "ایک گدھے کی سرگزشت" کو سماجی اور شعوری دستاویز مانا جاتا ہے۔عزیز احمد ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" میں حیدر آباد دکن کے جاگیردارانہ طبقے کی ایسی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتے ہیں کہ پورا کا پورا معاشرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔شہزاد منظر، شوکت صدیقی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> "شوکت صدیقی بنیادی طور پر سماجی حقیقت نگار ہیں وہ اردو میں ترقی پسند افسانوی روایت کے پیروکاروں میں شامل ہیں، جس کی بنیاد منٹو، بیدی اور غلام عباس نے رکھی تھی۔وہ

چونکہ نظری اعتبار سے ترقی پسند بلکہ اشتراکی ہیں اس لیے زندگی اور معاشرے کے بارے میں خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ جس کی جھلکیاں اس کے افسانوں اور ناولوں میں ملتی ہیں۔"[۹۵]

اسی تناظر میں شہزاد منظر، شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" پر بحث کرتے ہیں جب کہ ناول "جانگلوس" میں زندگی کے کئی تلخ، سفاک اور مکروہ حقیقتیں ناول کے کردار لالی کے کردار کے ذریعے سامنے لاتے ہیں۔ شوکت صدیقی کے کردار گورکی کے کرداروں سے ملتے جلتے ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے بھی گورکی کی طرح غربت اور افلاس میں زندگی گزاری ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی کے مطابق:

"خدا کی بستی میں وہ مدنی نچلے طبقے یعنی مزدور کی زندگی کی تلخیاں بیان کر رہے ہیں اور سرمایہ دار کے خلاف ذھن سازی کرتے نظر آتے ہیں تو جانگلوس میں وہ کسان کی حالت زار اور جاگیر دار و جاگیر داری نظام کی نکیر کرتے دکھائی دیتے ہیں"[۹۶]

سید بشیر حسین ناول "جھوک سیال" میں گاؤں کے تمام طبقات مثلاً جاگیر دار، چھوٹے کسان، بڑھئی، لوہار، چکی والا، مسجد کا امام، جاگیر دار کے گماشتوں، پٹواری اور پیر و مرشد سب کی بڑی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتے ہیں۔ جب کہ ناول "میرا گاؤں" لکھنے والا غلام ثقلین نقوی اگرچہ نہ ترقی پسند ہیں اور نہ ہی اشتراکی لیکن پھر بھی اپنے ناول میں دیہی عوام خصوصاً غریب کسانوں کا بڑے جاگیر داروں کے ہاتھوں استحصال کو موضوع بناتے ہیں۔

رومانیت:

نیاز فتح پوری کا ناول "ایک شاعر کا انجام" رومانیت کے غلبے کے زیر اثر شدید جذباتیت کا حامل ہے۔ جب کہ "شہاب کی سرگزشت" کا فلسفی نوجوان سماج کی روایتی اور پامال راہوں سے باغی ہے اور محبت کے بارے میں اس کی نظریات ماورائی سطح کے حامل ہیں۔ منشی فیاض علی کا ناول "شمیم" چار گھرانوں کی زندگی پر مشتمل رومانوی ناول ہے۔ عصمت چغتائی کا ناول "سودائی" ایک ادنی درجے کا ناول فلمی قصہ زیادہ لگتا ہے جس میں دو بھائی سورج اور چندر چاندنی پر عاشق ہو جاتے ہیں سنسنی سے بھرپور اس قصے کے آخر میں سورج زہر کا پیالہ پی کر مر جاتا ہے۔ ا۔ ض۔ حسن بیگم کے ناول "روشنک بیگم" (۱۹۲۰ء) پر رومانی انداز غالب ہونے کے ساتھ داستانی اثر بھی نمایاں ہے۔ ناول کے ہیرو ہمایوں فر داستان کے ہیرو کے طرح ہر خوبی سے مزین ہے۔ عابدہ رحمان "صرف ایک پل" میں روایتی محبت کی کہانی میں مذہب کا تڑکا شامل کرتی ہیں۔ خیام ثنا

"ڈھائی دن کی محبت " میں دہشت کے ماحول میں پروان چڑھتی محبت کو موضوع بناتی ہیں۔ آغا گل ناول "دشت وفا" میں ستر کی دہائی کی گوریلا تحریک کو رومانوی کہانی سے جوڑ دیتے ہیں۔ "بیلہ "ناول کوئٹہ کے ٹرانسپورٹر کی عشقیہ داستان ہے۔ تیسرے ناول "بابو" میں رومانوی کہانی کے ساتھ کوئٹہ کے دبستان اردو کو بھی سموتے ہیں۔ شجاعت علی راہی "عزیز اعجاز اور رومان کی خوش رنگ وادی" کے عنوان سے عزیز اعجاز کے ناول / ناولٹ "پشیمان چاہتیں"، "ساز دل" اور "ادھوری تصویر" کا جائزہ رومانیت کے حوالے سے لیتے ہیں۔ مضمون کے مطابق ان کہانیوں میں اعتدال و توازن کا خیال رکھا گیا ہے کہیں پر بھی جنسی جذبات کو ابھارنے کی کوشش نہیں ملتی یوں توازن کے عنصر کے اضافے سے اردو ناول نگاری کو تقویت دی ہے۔ شیر دل غیب اپنے ناولٹ "تیرے فراق میں"، "کوٹھی نمبر ۵۲"، "آخری خط" اور "۴۳" میں یونیورسٹی میں پروان چڑھنے والے عشقیہ قصوں کو موضوع بناتے ہیں لیکن ساتھ میں بلوچستان کی احساس محرومی کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ محبت کے موضوع پر مبنی ہاشم ندیم کے ناول "خدا اور محبت" کو جذبات نگاری کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ محبت کے ماجرے پر مبنی ناول "تکون کی چوتھی جہت" میں محبت کے اس رخ کو نمایاں کیا گیا ہے جسے انسانیت کہتے ہیں۔ عزیز احمد کا ناول "شبنم" شبنم کی روداد ہے۔ مصنف کی بیٹی ہونے کے ساتھ اس کے رگوں میں طوائف کا خون بھی ہے جس کی وجہ سے اس کی جنس ہمیشہ بیدار رہتی ہے۔ ناول کی زیادہ تر تفصیلات اس کے معاشقوں پر مبنی ہے۔ کرشن چندر رومانوی اور اشتراکی حقیقت نگاری کے ذیل میں انسان دوستی اور طبقاتی کشمکش کو ناول "شکست" میں پیش کرتے ہیں۔ ناول کا کردار شیام اپنے سے کم تر ذات کی لڑکی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے لڑکی اس کی محبت میں سماج سے ٹکرا جاتی ہے لیکن شکست دونوں کا مقدر بن جاتا ہے یوں ناول کے مطابق نوجوان طبقہ صدیوں سے رائج غیر انسانی سماجی نظام کو چاہنے کے باوجود بھی بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ بلونت سنگھ کا پہلا اینٹی ہیرو ناول "رات، چور، چاند" پنجابی فضا کا حامل رومانی مزاج کا ہے۔ ناول نگار شفق نے "بادل" میں رومانی کہانی کے پس منظر میں امریکی سامراجیت کا پردہ فاش کر کے اپنی عصری آگہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ناول نگار ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حملے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش مسائل کا احاطہ کرنے کے ساتھ امریکہ کے ہاتھوں عراق کے بعد افغانستان کی تباہی کی بھی پیشین گوئی کرتا ہے جسے وقت صحیح ثابت کر دیتا ہے۔

تقابل:

ڈاکٹر سلیم اختر کے مضمون کے مطابق ناول "بستی" میں جس طرح قبر اور شجر کے حوالے سے ماضی کو یاد کیا جاتا ہے اسی طرح انتظار حسین کے افسانے "ہندوستان سے ایک خط" میں بھی بزرگوں کی قبروں اور حویلیوں کے ساتھ کٹے درخت کا بھی ماتم کیا جاتا ہے۔یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ افسانہ اس ناول کا ابتدائی خاکہ ہو اور بعد میں اس موضوع کے وسیع امکانات کو محسوس کرتے ہوئے ناول لکھا گیا۔اسی لیے ناول "بستی" اور اس افسانے کا تقابلی مطالعہ دلچسپی کا حامل ہو سکتا ہے۔عام طور پر جدوجہد آزادی اور تقسیم ہندوستان کی تعبیری پس منظر میں یکسانیت کی وجہ سے "اداس نسلیں" کا موازنہ قراۃ العین حیدر کے "آگ کا دریا" کے ساتھ کیا جاتا ہے تاہم دونوں ناولوں کے جمالیاتی ضابطہ کار اور تکنیک میں فرق موجود ہے۔اسی بنا پر ڈاکٹر اقبال آفاقی مضمون کی ابتدا ان دونوں ناولوں کے تقابل سے کرتے ہیں۔محمد عباس کے مطابق ناول "نادار لوگ" زیادہ توانا اور دلچسپ ہے بہ نسبت "اداس نسلیں" کے اور اسی تناظر میں دونوں ناولوں پر بحث کی گئی ہے۔منزہ مبین "اداس نسلیں" اور "باگھ" کے مرکزی کرداروں اور فضا میں موجود مشابہت کی بات کرتی ہیں۔

ہیئتی طریقہ:

تاریخ کے چار ادوار کے احاطے پر مبنی ناول "آگ کا دریا" میں مہاتما بدھ سے ایک سو سال بعد کا دور،ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا دور،انگریزوں کے قدم جمانے کے دور اور بیسویں صدی کے تیسری،چوتھی اور پانچویں دہائی کو کرداروں کی ڈوری کے ذریعے جوڑے رکھا ہے۔ناول کے یہ مخصوص کردار ہر زمانے کی تصویر پیش کرتے ہیں جب کہ نسوانی کردار چمپا،چمپک اور چمپا احمد کے نام میں خفیف سی تبدیلی ہندوستان میں ہونے والے تغیر کی علامت ہے۔احسن فاروقی ناول "سنگم" میں اسی ساختی تجربے کے استعمال سے برصغیر میں مسلمانوں کے نو سو سالہ تاریخ کو پیش کرتے ہیں۔ڈاکٹر احسن فاروقی ناول "شام اودھ" میں ڈرامائیت کے عنصر کا استعمال کرتے ہیں۔ناول "بستی" کو سوانحی ناول کہا جاتا ہے۔اس ناول میں ناول کی روایتی تکنیک سے بغاوت کی گئی ہے۔انتظار حسین کے اس ناول میں وقت کے تین دائرے ملتے ہیں۔قدیم وقت کہ جب سب کچھ اصولوں کا پابند تھا۔روپ نگر میں ذاکر کا گزرا ہوا وقت اور لاہور میں ذاکر کی زندگی۔زماں و مکاں کے یہ تین ادوار اگرچہ ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں تاہم ذاکر کی یادوں میں یہ ایک دوسرے پر lap over کرتے ہیں۔یوں ناول کے پلاٹ میں زماں و مکان کو توڑنے کے حوالے سے یہ ناول پاکستانی ادب

میں نمایاں مقام رکھتا ہے جب کہ دوسرا ناول "تذکرہ" بھی ناول کی روایتی تکنیک میں نہیں لکھا گیا بلکہ یہ تذکرہ کی ہئیت میں لکھا گیا ناول ہے جس میں ایک خاندان کی نسل در نسل آپ بیتی کے ساتھ موجودہ زمانے کے تہذیبی، سیاسی اور سماجی صورت حال کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ عبد اللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" جلیانوالہ باغ کے واقعے کی رپورٹنگ کے علاوہ باقی سارا کا سارا ناول ہمہ دان راوی کی ہئیت میں لکھا گیا ہے جو کہ سبھی کرداروں کے متعلق سب کچھ جانتا ہے جب کہ ناول "نادار لوگ" کا بیانیہ کبھی ہمہ دان راوی کے ذریعے آگے بڑھتا ہے جب کہ بیشتر حصہ کرداروں کی یادداشت، فلیش بیک، خط اور خود کلامی کی صورت میں تشکیل دیا گیا ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک پر مبنی انور خان کا ناول "پھول جیسے لوگ" کا بیانیہ ٹوٹ پھوٹ کے عمل پر بنی ہے اور اسی تکنیک کی مدد سے اپنے انجام تک پہنچایا گیا ہے۔ شائستہ فاخری اپنے ناول "صدائے عندلیب بر شاخ شب" میں خود کلامی، فلیش بیک اور فلیش فارورڈ کی تکنیک سے استفادہ کرتی ہیں۔ بے معنویت اور لایعنیت کے موضوع پر مبنی ناول "غلام باغ" میں

> "نثری مشقیں، مکالمے، کتابوں کے اقتباسات، روزنامچے، خطوط، رجسٹر کے ذریعے کرداروں کو تخلیقی وسعت دی گئی ہے۔ کیمرے کی اصطلاحیں جیسے فیڈ ان، پین شاٹ، ٹریکنگ شاٹ، سلو موشن، زوم ان، کلوز شاٹ، ٹاپ شاٹ، لانگ شاٹ وغیرہ کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔"[۹۷]

ناول "بھید" میں عاصم بٹ نے "بھول بھلیاں" (Labyrinth) کی تکنیک کے استعمال سے بتاتے ہیں کہ زندگی ایک گورکھ دھندا ہے۔ اور اگر اس کی بھول بھلیوں میں ایک دفعہ انسان داخل ہو جائے تو بھٹکتا رہتا ہے اور بغیر کسی گائیڈ یا نقشے کے نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔ "یہاں بیانیے اور پلاٹ کے روایتی فریم سے آزاد ہونے کی واضح کوشش ملتی ہے"[۹۸] کاشف رضا کا ناول "چار درویش اور ایک کچھوا" میں راوی کا کردار مسلسل بدلتا رہتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کے ناول "جاگے ہیں خواب میں" پلاٹ کی روایتی ترتیب مکمل طور پر الٹی ہے۔ آغاز سے ہی تہ در تہ الجھی ہوئی کہانی اسی بے ترتیبی سے سلجھتی جاتی ہے جب کہ دوسرے ناول "جندر" میں کیفیت کو وقت کی قید سے نکالنے کی کاوش ملتی ہے۔ قاضی عبد الغفار کا ایک اہم کارنامہ اردو ناول میں نئی تکنیکوں کا استعمال کرنا ہے۔ انہوں نے ہی پہلی دفعہ ناول "لیلی کے خطوط" میں خط کی تکنیک اور "مجنوں کی ڈائری" میں ڈائری کی تکنیک کا استعمال کر کے انسانی ذہن کو کھنگالنے کی کوشش کی جب کہ بعد میں آنے والوں نے اس مقصد کے لیے شعور کی رو کا استعمال کیا۔ واحد متکلم سے شروع ہونے والا جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاش

بہاراں" دراصل ناول کی ہیروئن کنول کماری ٹھاکر کی سوانح عمری ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے پاکستان کے مختلف مقامات کی سیاحت کی ہے انہوں نے اپنی معلومات ناول " آبلہ پا" میں قارئین تک پہنچانی کی کوشش کی ہے یوں ناول کا نام دینے کے باوجود یہ سفر نامہ لگتا ہے۔ اس ناول میں طویل خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔ زیف سید ناول " آدھی رات کا سورج" میں سپین اور اندلس کے عروج و زوال کی کہانی کو سفر نامے کے تکنیک میں لکھتے ہیں جب کہ خالد قیوم تنولی کا" غبار سفر "مکتوباتی تکنیک میں لکھا گیا ناول ہے۔ محمد الیاس کے ناول "کہر" میں کئی کردار ہیں اور ہر کردار کہانی میں ایک نئی جہت کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ یہی اس ناول کی کامیابی کی وجہ ہے۔ ناول "انار کلی" میں مرزا حامد بیگ فکشن کی نثر کی مدد سے ایک محقق کی جمع کردہ مواد کو ناول میں ڈھال لیتے ہیں۔ عاطف علیم "گردبار" میں تکنیک کے نام پر پلاٹ میں اکھاڑ پچھاڑ کی بجائے کرداروں کی ماجرائی اور نفسیاتی سطح پر تعمیر سے لطف پیدا کرتے ہیں۔ خالد محمد فتح کا ناول "زینہ" واحد متکلم کے صیغے میں لکھا گیا ہے۔ زیف سید "گل مینہ" میں فلیش بیک کی تکنیک سے مدد لیتے ہیں۔ پانی کی فطری بہاو کو موضوع بناتا آمنہ مفتی کا ناول "پانی مر رہاہے" میں جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک کا استعمال ملتا ہے۔ اقبال خورشید ناول "تکون کی چوتھی جہت" میں ہئیت کو توڑ کر الگ طریقوں سے پھر جوڑتے ہیں اور اس جوڑنے میں ایک سے زیادہ راوی حصہ لیتے ہیں۔ اینٹی پلاٹ کے حوالے سے فہیم اعظمی کے ناول "جنم کنڈلی"، انور سجاد کے "خوشیوں کا باغ" اور انیس ناگی کے "سکریپ بک" کی نشاندہی کی گئی ہے۔ منتشر پلاٹ کی مثالیں فاروق خالد کے "سیاہ آئینے" مرزا اطہر بیگ کے "غلام باغ" مستنصر حسین تارڑ کے ناول "منطق الطیر جدید" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ پیچیدہ پلاٹ کے حوالے سے مرزا اطہر بیگ کا " غلام باغ"، "حسن کی صورت حال"، "صفر سے ایک تک" مستنصر حسین تارڑ کا "راکھ"، "بہاؤ"، "خس و خاشاک زمانے"، عاصم بٹ کا "دائرہ" اور "بھید" کا ذکر ملتا ہے۔ داخلی پلاٹ کے حوالے سے انتظار حسین کے ناولوں "بستی"، "تذکرہ" انیس ناگی کے "دیوار کے پیچھے"، "میں اور وہ" کی مثالیں دی گئی ہیں۔ لچکدار پلاٹ کے حوالے سے عبد اللہ حسین کا "نادار لوگ"، بانو قدسیہ کا " حاصل گھاٹ"، خالدہ حسین کا "کاغذی گھاٹ"، طاہرہ اقبال کا "نیلی بار" مستنصر حسین تارڑ کا "اے غزال شب" جبکہ ڈرامائی پلاٹ کی مثالیں انور سجاد، انیس ناگی، اکرام اللہ، مرزا اطہر بیگ اور عاصم بٹ کے یہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ستر کی دہائی کے بعد کے جدید ناولوں میں تکنیک کے حوالے سے بھی بہت سے تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں جیسے کہ مونتاژ (Montage) کی تکنیک کو مستنصر حسین تارڑ، عاصم بٹ اور مرزا اطہر بیگ نے کامیابی سے برتا ہے۔ امیجری کی تکنیک کا استعمال عبد اللہ حسین، بانو قدسیہ، انتظار حسین، حسین

منظر، مستنصر حسین تارڑ، اختر رضا سلیمی اور آمنہ مفتی کے یہاں ملتا ہے۔ مکالماتی تکنیک کا استعمال انتظار حسین نے "تذکرہ"، "آگے سمندر ہے" انیس ناگی نے "دیوار کے پیچھے"، "میں اور وہ" عبداللہ حسین نے "قید" اور "باگھ" مرزا اطہر بیگ نے "غلام باغ"، "صفر سے ایک تک" عاصم بٹ نے "دائرہ" اور "بھید" میں کیا ہے۔ قصہ گوئی یا کہانی در کہانی کی تکنیک کے حوالے سے انتظار حسین کا "بستی"، عبداللہ حسین کا "نادار لوگ" مستنصر حسین تارڑ کا "خس و خاشاک زمانے" اہم ہیں۔ فلیش بیک، پیش بینی اور پیش گوئی کی تکنیک اختر رضا سلیمی کے "جاگے ہیں خواب میں" اور "جندر" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مختلف النوع راوی کی تکنیک حمید شاہد کے ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" اور مرزا اطہر بیگ کے "غلام باغ" میں جبکہ آپ بیتی کے تکنیک کی مثالیں انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، فہیم اعظمی، انیس ناگی، مرزااطہر بیگ اور عاصم بٹ کے یہاں دیکھی جاسکتی ہیں اور رپورتاژ کی تکنیک مستنصر حسین تارڑ، اشرف ناشاد اور بین المتنیت کی تکنیک کا استعمال انتظار حسین، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، مستنصر حسین تارڑ اور مرزا اطہر بیگ کے یہاں ملتا ہے۔ قدیم بمعنی جدید کی تکنیک انتظار حسین، انور سجاد، جمیلہ ہاشمی، مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ، کاشف رضا اور اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں میں استعمال کی ہے جبکہ مخلوط تکنیک کے حوالے سے صرف مرزااطہر بیگ کے ناول "غلام باغ" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ خالد محمد فتح ناول "خلیج" میں سادہ بیانیے کو اجنبی صورت دینے کے ساتھ، اپنی آپ بیتی کو منصفانہ بیانیے کی بجائے مرکزی کردار کے عمل اور تعامل میں دکھاتے ہیں جب کہ "سانپ سے زیادہ سیر اب" میں سادہ اور سہل بیانیے میں طلسمی انداز کا احساس دلاتے ہیں۔ ناول "ٹبا" میں طلسمی حقیقت نگاری کے استعمال کے حوالے سے امریکی لاطینی فکشن نگاروں کی پیروی کرتا ہے۔ انور سجاد "غلام باغ" میں حقیقت نگاری، مونتاژ، نثر، تلازمہ خیال اور تبصروں سے مدد لیتے ہیں۔

اسلوب:

عبداللہ حسین کی نثر بامحاورہ نثر نہیں اور نہ ہی سپاٹ ہے بلکہ عبداللہ حسین پنجابی الفاظ کے ساتھ پشتو اور انگریزی زبان کا رنگ ڈھنگ بھی اپنی وضع کردہ نثر میں شامل کرتے ہیں۔ مقامی لہجے اور الفاظ وتراکیب کی آمیزش پر مبنی اس نثر کو بجا طور پر پاکستانی اردو نثر کہا جاسکتا ہے کیونکہ پاکستان کے ہمہ رنگ ثقافت کی عکاسی بخوبی کرتا ہے۔ ناول "اداس نسلیں" کی مقبولیت کی وجوہات میں سے ایک وجہ اسی نثر کا تجربہ بھی تھا۔ محمد عاصم بٹ کے مطابق:

"اس نثر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، آہنگ اور لفاظی میں مقامیت پسندی، بیان کی سادگی و پرکاری، بیگانگی وکم آمیزی سے پیدا ہونے والی کھردراہٹ اور اداسی اور تنہائی کی پرسوز فضا میں بھرا ہوا نم۔۔۔اور اس میں گہرا اور نرم رومان بھی ہے۔ فطرت سے وابستگی بھی اس نثر کی تروتازگی میں اپنا حصہ ڈالتی ہے"(۹۹)

جہاں جہاں عبد اللہ حسین ناسٹلجیا کی زد میں آتے ہیں ان کی نثر میں گہری جاذبیت اور سوز پیدا ہو جاتا ہے۔ عبد اللہ حسین کی کتاب "نشیب" کی نثر ناسٹلجیا کی نمی سے بھری ہے۔ ناول "باگھ" کی نثر کی تاثیر کو ناسٹلجیا میں رومان کی آمیزش دوچند کر دیتی ہے۔ جبکہ "قید" میں رومان کی جگہ غصے اور احتجاج کے غلبے کی وجہ سے نثر کی کھردراہٹ بڑھ جاتی ہے۔ امان اللہ محسن کے مضمون "نیا ناول: نئے تجربات" کے مطابق ۱۹۷۰ء کے بعد موضوعاتی، تکنیکی جدت کے ساتھ اسلوبیاتی لحاظ سے بھی ناول میں جدت دیکھنے کو ملی ہے۔ مضمون نگار کے مطابق علامتی و استعاراتی اسلوب کو انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، عبد اللہ حسین، انور سجاد فہیم اعظمی اور انیس ناگی نے برتا ہے۔ شاعرانہ اسلوب کے نمونے جمیلہ ہاشمی، مظہر اسلام اور خورشید اقبال کے یہاں ملتے ہیں۔ مخلوط زبانی اسلوب کی مثالیں مستنصر حسین تارڑ، مرزا اطہر بیگ، حسن منظر، عاصم بٹ، انیس ناگی کے یہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ حقیقت پسندانہ و کھردرا اسلوب کا تجربہ انیس ناگی، مستنصر حسین تارڑ، عاصم بٹ، مرزا اطہر بیگ، طاہرہ اقبال اور آمنہ مفتی نے اپنے ناولوں میں کیا ہے۔ رپور تاژیانہ اسلوب کو اشرف ناشاد نے اپنے ناولوں "بے وطن"، "صدر" اور "وزیر اعظم" میں برتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ناولوں میں تفہیم کی مختلف امکانات کے لیے مبہم اسلوب کی مدد سے تحیر و لطف کو بڑھا دیا گیا۔ جدید ناول کا جدید زندگی کے پر اسرار اور گنجلک واقعات کی عکاسی کی وجہ سے اسلوب کے لحاظ سے بھی الجھن، پیچیدگی اور گنجلک کا احساس ہوتا ہے۔ ماورائے لسانی اسلوب کا استعمال مرزا اطہر بیگ کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ انتظار حسین کا اختراع کردہ داستانوی اسلوب کے اثرات مستنصر حسین تارڑ کے یہاں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ شکستہ اسلوب کی مثالیں انور سجاد، انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، انیس ناگی، فہیم اعظمی کے ناولوں میں ملتی ہیں۔ ناول "فرات" کے مصنف حسین الحق عموماً اسلامی استعاروں سے کام لیتے ہیں۔ ان کے ناول کے متعلق نور الحسنین لکھتے ہیں کہ "وہ جہاں حقیقی پیرائیہ اظہار اپناتے ہیں وہاں ضرور تا تشبیہات اور استعاروں سے بھی کام لیتے ہیں جس کے سبب کہانی، معنی اور مفہوم کے کئی شیڈ اپنے دامن میں سمیٹے آگے کی جانب بڑھتی ہے"(۱۰۰)۔ صلاح الدین پرویز اپنے ناولوں "نمرتا"، "سارے دن کا تھکا ہوا پرش"، "ایک دن بیت گیا"، "آئیڈنٹی کارڈ"، "دی وار

جرنلسٹ"، "اور ایک ہزار دو راتیں" میں عربی، فارسی اور ہندی لفظیات کی آمیزش سے تہ در تہ معنی ومطالب کے اسرار قائم کرتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، انتظار حسین کے ناول "بستی" کے متعلق ڈاکٹر تحسین فراقی کی اس رائے سے استفادہ کرتے ہیں کہ:

> "مجھے "بستی" ان اسالیب کی جامع نظر آتی ہے جو انتظار حسین کے افسانوں کے مختلف مجموعوں میں بکھرے ہوئے تھے "بستی" میں آپ کو اساطیری فضا ملے گی؟ ایسے توہمات بھی ملیں گے جنہیں مذہبی تقدس کا درجہ حاصل ہے، تمثیلی انداز بھی ملے گا، حکمت و دانش پر مبنی بزرگانہ اقوال بھی ملیں گے، لوک دانش پر مبنی تمثیلات بھی، اور سب سے بڑی بات کہ یادکا وہ خزانہ بھی ملے گا جو انتظار حسین کے ہاں شاید کبھی ختم نہ ہو گا"[۱۰۱]

اسی طرح انتظار حسین ناول "تذکرہ میں اسلوبیاتی سطح پر داستان، اساطیر، قصے کہانیاں، کتھا جیسی اصناف سے استفادہ کرتے ہیں۔ سادہ بیانیے کے حامل کہانیوں میں ہاشم ندیم فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔ وسیم شاہد اسی تکنیک کی مدد سے کہانی کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ خیام ثنا اپنی کہانی کے لیے ڈائری اور ایس ایم ایس کی تکنیک سے استفادہ کرتے ہیں۔ آغا گل اپنے ناولوں میں لوکیل کے ساتھ تشبیہات اور استعارے بھی بلوچستان کے استعمال کرتے ہیں۔ مختار علی کا ناولٹ "گلیاں اور بازار" موضوع کے ساتھ اسلوب کے لحاظ سے بھی متاثر کن ہے کیونکہ ڈاکٹر سید زبیر شاہ کے اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں کہ "راگوں کا حوالہ ہو یا موسیقی کا صوتیاتی آہنگ، ہر جگہ مصنف کی فنی پختگی کا ثبوت ملتا ہے۔"[۱۰۲] سعد اللہ جان برق کا ناول "شب چراغ" کا اسلوب اور لفظیات پختون ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ناول میں مصنف جگہ جگہ پشتو ضرب الامثال اور محاوروں کا لفظی سطح پر اردو میں ترجمہ کرتے ہیں جس سے بالکل ایک نیا پیرایہ بیان سامنے آتا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی ناول "کئی چاند تھے سرے آسمان میں "۱۸۱۱ء سے ۱۸۵۵ء تک کے زمانے کی زبان کو تخلیقی سطح پر ناول کا حصہ بنا کر ایک زوال پذیر تہذیب کا مرقع پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید شاہد، خالد جاوید کے ناول "نعمت خانہ" کے نثر کا ذکر یوں کرتے ہیں "کہ اس میں بھی معنی کی ترسیل کی رفتار مدہم ہو کر اور گہرائی تک رسائی عطا کر جاتی ہے۔"[۱۰۳] انیس اشفاق کے ناول "دکھیارے" کی کامیابی میں بھی اس کے بیانیہ کا ہاتھ ہے راوی کا بیانیہ کہیں بھی آرائشی نہیں حتیٰ کہ معاشقوں کے ذکر کے وقت لاحاصلی کے احساس تک کو نثر میں ابھارا گیا ہے۔ سید محمد اشرف "آخری سواریاں" میں گنگا جمنا کے کنارے جنم لینے والے تہذیب کے دور زیاں کے تہذیبی بیانیے پر مشتمل ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے ناول "لے سانس بھی آہستہ "کا

ذکر بیانیہ کے حوالے سے ملتا ہے۔ مجامعت لفظ کے ہمارے لغت میں اگرچہ کوئی معنی نہیں تاہم رحمٰن عباس کا ساڑھے تین سو سے زائد صفحات کا ناول "روحزن" اس لفظ کو ایسے معنی عطا کرتا ہے کہ "جو ہماری زندگی سے جڑ کر کئی سوالات قائم کر دیتی ہے۔"(۱۰۴) حسن منظر کے ناول "العاصفہ" اور "حبس" کا ذکر بھی بیانیے کی دلکشی کا ذکر ملتا ہے۔ حقیت نگاری کے اسلوب پر مبنی حسن منظر کا ناول "العاصفہ" کا بیانیہ اور ٹریٹمنٹ اکہرے پن کی بجائے تہ داری کا حامل ہے جو ان کے کرداروں کے انفرادی اور سماجی رویوں کو بیان کرتا ہے۔ عربی میں العاصفہ صحرا کی آندھی کو کہتے ہیں جو ریت کے جھکڑ لیے ہوئے آتی ہے۔ ناول نگار، ناول میں العاصفہ کے لغوی معنی کے علاوہ استعاراتی معنوں کے ذریعے عرب دنیا کے رویوں، اس کے سماجی صورت حال اور اقوام عالم میں کردار سے بھی جوڑ دیتے ہیں۔ اپنے دوسرے ناول "حبس" میں بھی حسن منظر اسی بیانیے اور اسلوب سے کام لیتے ہیں۔ مرزا اطہر بیگ جبلت، جنس، سائنس اور فلسفے کو کہانی کے بین السطور میں رکھ کر عصری زندگی کے مسائل کو بیان کرتے ہیں لیکن اس کا بیان زبان و بیان کے مروجہ سانچوں کی مدد سے مشکل ہے۔ جس کے لیے مصنف اپنے تینوں ناولوں "غلام باغ"، "صفر سے ایک تک" اور "حسن کی صورت حال" تک میں بیانیہ اور لسانی تشکیل کے تجربات کرتے ہیں۔ شیخ صلاح الدین نے ناول "خوشبو کی ہجرت" کے ذریعے جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک تب متعارف کرائی ہے کہ جب جادوئی حقیقت نگاری کا گروپ سامنے نہیں آیا تھا۔ مصنف اپنے بیانیے میں ہندی، سنسکرت، فارسی اور عربی کے میلاپ، نئی اردو لفظیات، ہندی کے حروف فاعلی، مفعولی، اضافت، نسبت، ربط، ضمائر کے استعمال سے غیر روایتی، طویل اور پیچیدہ جملے تخلیق کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مطابق:

> "اس ناول میں کوئی ایک نہیں، کئی ایک اسالیب بیان، از قسم فلسفیانہ، محققانہ، توضیحی، تجریدی، ردھمک، متناقص الخیال اور میجک رئیلزم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی لیے ناول کے ہر حصے اور ہر حصے کے باب میں نثری لحن جداگانہ اور نثری آہنگ مختلف ہے۔ پلاٹ کی ڈویژن، کہانی کی Diversion، ماحول سازی، کردار نگاری، ظاہری اور باطنی جذبات کے تغیر و تبدل، نیز مرئی اور غیر مرئی اجسام کے بیان میں ایسے ایسے متنوع پیرائہ اظہار برتے گئے ہیں جو اس قبل اردو کے کسی فکشن نگار کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملتے۔"(۱۰۵)

وحید احمد ناول "زینو" میں قدیم داستانوں، حکایتوں اور اساطیری اسلوب سے استفادہ کرتے ہیں۔ سائنسی کلیے، معیشت کے اسرار و رموز، الہامی کتابیں، قدیم رزمیہ نظمیں، یونانی ڈرامے، تاریخی دستاویزات جیسے خام مواد کو اکائی کی صورت میں ناول کا حصہ بناتے ہیں۔ خالدہ حسین ناول "کاغذی گھاٹ" میں زیادہ تر مکالموں سے کام لیتی ہیں تاہم ناول کے وسطی حصے میں سٹریم آف کانشیسنس اور مونولاگ سے کام لیتی ہیں جب کہ ناول کے آخری حصے میں ڈرامے کی تکنیک سلولی لوکی (soliloquy) سے کام لے کر تلخ ترین حقائق کو ناول کا حصہ بناتی ہیں۔ واحد متکلم کے صیغے میں لکھا گیا انیس اشفاق کا ناول "خواب سرائے" میں حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے تہہ داری اور فکر انگیزی پیدا کی گئی ہے۔ لکھنو کی دلکش فضا، زبان، کلچر، عادتوں، کھانوں، مجلسوں، سوز خوانی اور نوحہ خوانی نیز کرداروں کے مر جانے کے موقع کا بیان اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ قاری بھی اس کیفیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔ نیز ناول نگار اسکیچی کرداروں علی رضا اور سرتاج مرزا کے ذریعے ہمیں سردار بیگم، جہاں دار بیگم، حکیم صاحب، بوا سلیمن، شہبا، ہینگا، کمو، شمیلہ خانم اور سبیلہ جیسے کرداروں سے متعارف کراتے ہیں جو کہ ہمیں گزرے ہوئے زمانے میں پہنچا دیتے ہیں۔ مختصر اقدیم لکھنو کی بازیافت کے لیے کبھی مکالمے، کبھی فلیش بیک کی تکنیک سے مدد لی گئی ہے تو کبھی سابقہ واقعات کو ناموجود ہیولوں کی مدد سے بیان کیا گیا ہے ناول میں مردوں سے گفتگو فلیش بیک کی بجائے واہمے کی صورت میں ملتی ہے۔ آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" کا پلاٹ کثیر المعنی اور تہ داری کا حامل ہے۔ جس کا اندازا ناول کے عنوان سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مرنے کا مطلب جان سے جانا یا فوت ہونا تو ہے لیکن اس کا ایک مطلب جذب ہونا یعنی فقرے 'دیوار میں پانی مر گیا ہے' کا مطلب دیوار میں پانی جذب ہو گیا لیکن ساتھ میں ذہن 'دیدوں کا پانی مر گیا ہے' کی طرف بھی چلا جاتا ہے اور یہی کثیر لمعنویت اور تہ داری ناول کے پورے پلاٹ میں موجود ہے۔ سید محمد اشرف کے "نمبر دار کا نیلا" اور "آخری سواریاں" پر بھی اسلوب کے حوالے سے بحث ملتی ہے۔ ناول "نمبر دار کا نیلا" تمثیل سازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ ناول میں جانور رفتہ رفتہ اپنے مالک کی فطرت اختیار کر لیتا ہے۔ شمیم حنفی کے مطابق:

> """نمبر دار کا نیلا" میں ایک خاص عہد کے شعور کو پار کر لینے کی استعداد صاف دکھائی دیتی ہے۔ لفظوں کا ایک جان دار ذخیرہ اور بڑا ذخیرہ، بیان کی ایک فطری مہارت، انسانی رویوں اور تجربوں کے علامتی تبدل کا سلیقہ اور تمثیل سازی کی خلاقانہ صلاحیت اور اسی

کے ساتھ تشدد اور دہشت کے موجودہ ماحول پر خاصی منضبط فطری گرفت نے اس ناولٹ کو یادگار تخلیق بنادیا۔"[۱۰۶]

جب کہ ناول "آخری سواریاں" کی کامیابی میں بھی اسلوب کا بڑا ہاتھ ہے۔ ناول نگار نے اس ناول میں اپنے اسلوب اور صناعی کی بدولت ایک ایسی دنیا تشکیل کی ہے کہ جس میں نہ ابہام ہے نہ سپاٹ بیانیہ بس ایک احساس زیاں کی کیفیت ہے جو ہمیں اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ نیلم بشیر احمد ناول "طاؤس فقط رنگ" میں محاورات، اردو کے ساتھ پنجابی اور کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کرتی ہیں۔ اسلم سراج الدین کے ناول "تلاش ربور" پر مترادفاتی، استفہامیہ اور جیمز جوائس یولیسی کے اثرات کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کے فکشن نے اپنے سے پہلے کے تمام بیانیوں کو کثیر اسلوبی یا کثیر صوتی(Polyphonic) تکنیک کی صورت میں اپنے اندر سمولیا ہے۔ محمد حفیظ خان کے دونوں ناول "انواسی" اور "ادھ آدھورے لوگ" اور عاطف علیم کا ناول "گردبار" کثیر اسلوبی انداز کے حامل ہیں نیز چیک مصنف میلان کنڈیرا بھی اسی طرز تحریر کے نمائندہ تھے۔

ب۔ ادبیات میں غیر افسانوی نثر پر مبنی تحقیقی و تنقیدی تحریریں

الف۔ سوانح عمری / آپ بیتی:

مدح نامہ

ڈاکٹر منور ہاشمی کے مضمون کے مطابق قومی مقصد کے تحت لکھی گئی سوانح عمری "یادگار غالب" نے نہ صرف سوانح عمری کی صنف کو آگے بڑھایا بلکہ "غالبیات" کے شعبے کے قیام کا باعث بھی بنی۔ یہ سوانح عمری جہاں غالب کے کلام کے بعض حصوں کی جاندار شرح پر مبنی ہے وہیں حالی نے اس میں غالب کی خوب تعریف توصیف کر کے شاگردی کا حق ادا کر دیا اور عقیدت و ارادت کے جذبات کے اسی غلبے کی بدولت غالب کی ذاتی زندگی کا بیان مایوس کرتا ہے۔ شگفتہ پروین، صالحہ عابد کی تصنیف کردہ سوانح عمری "یادگار حالی" کے خوبیوں اور خامیوں کا احاطہ مذکورہ کتاب کے ابواب "نشو نما"، "آب و رنگ" اور "برگ و بار" کے تحت کر کے حالی سے متعلق ایک اور جامع سوانح عمری کی سفارش ان لفظوں میں کرتی ہیں کہ

"میری دانست میں اگر صالحہ عابد اور محمد اسماعیل کی لکھی گئی سوانح عمریوں کو سامنے رکھ کر ایک اور سوانح عمریوں کو سامنے رکھ کر ایک اور سوانح عمری ترتیب دی جائے تو ایک مجمل سوانح عمری سامنے آسکتی ہے۔ کیوں کہ صالحہ نے جو واقعات درج کیے ہیں ان کا ماخذ زیادہ تر

خاندان حالی ہے اور جو اسماعیل پانی پتی کی کتب اور دیگر دوست احباب اور دیگر دوست احباب اسی طرح غیر مطبوعہ کتب کا تعارف بھی "تذکرہ حالی" میں موجود ہے جب کہ "یادگار حالی" میں اس طرح توجہ نہیں دی گئی۔یہ نکات میرے دلیل کو روشن کرتے ہیں۔"(۱۰۷)

ڈاکٹر اسد مصطفی "حیات حالی از منشا پانی پتی" کے تیرہ ابواب کے مختصر جائزے کے بعد اس تصنیف کو منشا کا نیاز مندانہ رویہ قرار دیتے ہیں کیوں کہ سوانح میں وہ مولانا کے زبردست حامی اور مداح نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر اسد مصطفی خوبیوں اور خامیوں کے بعد اس مسودے کو حیات حالی پر ایک عمدہ قلمی نسخہ اس لیے گردانتے ہیں کہ اس سے حالی کی زندگی کے متعدد گوشے، پسند ناپسند، نجی زندگی اور تعلقات وغیرہ پر مبنی تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

تاریخ:

کلیم احسان بٹ اور محمد شعیب خان، انتظار حسین کی سوانح عمری "چراغوں کا دھواں" کو زیر بحث لاتے ہیں کلیم احسان بٹ آپ بیتی نما اس کتاب کو سوانح کی بجائے انتظار حسین کے پچاس سالہ ادبی زندگی کی روداد قرار دیتے ہیں بلکہ یہ پاکستان بالخصوص لاہور کی ادبی تاریخ ہے جس میں ہر جگہ ہر موقع کا عینی شاہد خود انتظار حسین ہے۔کلیم احسان بٹ اور محمد شعیب خان اس تصنیف میں س چیدہ چیدہ واقعات اور شخصیات کے خاکے مضمون کا حصہ بناتے ہیں۔ادریس بابر یاد رفتگاں میں اشفاق یوسفی کے فن اور شخصیت کو موضوع بناتے ہیں۔

الف۔ الاقربا میں افسانوی نثر پر مبنی تحقیقی و تنقیدی تحریریں

ا۔افسانے پر مبنی آرٹیکل (افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے)

ا۔افسانے پر مبنی آرٹیکل

معیشت:

الاقربا کے مجلوں میں معاشی حوالے سے ایک ہی مضمون میں کرشن چندر کے افسانوں پر بحث ملتی ہے۔ جس کے مطابق مارکسی نظریات کے تحت کرشن چندر کے افسانے طبقاتی کشمکش اور معاشی عوامل کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کا افسانہ "مہالکشمی کا پل" دکھاتا ہے کہ انسان غربت کے ہاتھوں پستی کی کون سی حد چھو سکتا ہے۔ افسانہ "کچرا بابا" سرمایہ دارانہ بے حسی کو موضوع بناتا ہے۔ افسانہ "پیاسا" کا ذکر بھی معاشی حوالے سے کیا گیا ہے۔ تقسیم کے خوفناک نتائج دیکھنے کے بعد کرشن چندر انسان دوستی کے تحت ہر قسم کی تقسیم، استحصال کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ افسانہ "بگھت رام" ایسا ہی افسانہ ہے۔

معاشرت / سماج

سماجی حوالے سے مباحث دو تبصروں اور ایک مضمون کی شکل میں ملتے ہیں ۔طارق بن عمر کے مضمون کے مطابق سماجی و معاشرتی تغیر کو سمجھنا اور اس میں اپنے آپ کو ڈھال لینے میں ہی انسان کی کامیابی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی اس تغیر کا ساتھ نہیں دیتا تو اس کی زندگی پر چھائے ہوئے جمود کی ذمہ داری معاشرے کی نہیں اس کی اپنی ہے۔ خدیجہ مستور کے افسانے "راستہ" کا مرکزی کردار اس سوچ کی بخوبی نمائندگی کر رہا ہے جو اپنی زندگی میں چھائے ہوئے جمود کا بوجھ معاشرے کی بجائے اپنے آپ پر ڈالتا ہے۔ یہ کردار محبوبہ کے امیر آدمی سے شادی کرنے پر اپنے مستقبل کو لات مار کر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتا ہے۔

روبینہ فیصل کے افسانوی مجموعے "گم شدہ سائے" پر ناقدین کی آرا کے مطابق روبینہ فیصل کی کہانیاں جہاں ہمارے معاشرے کے زندی اور جیتے جاگتے کرداروں کی کہانیاں ہیں وہیں ان کے افسانوں کا ایک اور اہم موضوع ہجرتی زندگی کے مسائل کا بیان بھی ہے انہوں تارکین وطن اور مہاجرین کے نفسیاتی، معاشرتی اور معاشی پہلوؤں کو مہارت سے بیان کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ ان کا خود بھی اس عمل سے گزرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر کہانیوں میں مصنفہ کی اپنی ذات بھی کہیں نہ کہیں در آتی ہے۔ عارف محمود کسانہ کی کتاب "بچوں کی سبق آموز کہانیاں" کو سماجی تناظر میں یوں دیکھا گیا ہے:

"کسی سماج کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے بچے بہت اہم ہوتے ہیں۔سماجی ترقی کا دارومدار مستقبل کی نسلوں پر ہی ہوتا ہے۔بچوں کے لیے محنت، تعلیم و تربیت کا انتظام و انصرام گویا ایک صدی کی تربیت ہے۔انہی خیالات کا عملی جامہ "سبق آموز کہانیاں" ہیں۔"(۱۰۸)

موت:

موت کے موضوع کے تحت لکھے انور خان کے افسانے موت کے مختلف شیڈز دکھاتے ہیں۔ مثلا "شاندار موت" دلی حسرتوں کے پورانہ ہونے "گونج" عمر دراز آدمی کے موت کی یاد میں بے حالی پر مبنی ہے "ماتم گسار" میں موت جیسے موضوع پر گفتگو کرنے والے خود ہوش و خرد سے ماوراہیں جب کہ "روزن" میں زندگی کو ایک دن کا بتاکر آخرت کی تیاری کا نکتہ ملتا ہے اور آخر میں افسانہ "اسیر زیست" کے مطابق موت ہر چیز پر بھاری ہے کسی کو موقع نہیں دیتی۔

تہذیب:

اشرف سہیل کے مضمون اور حلقہ ارباب ذوق کی آصف الرحمٰن طارق کے ساتھ شام افسانہ کی نشست کے مطابق ڈاکٹر طارق کے افسانوں میں تہذیب و ثقافت کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کے افسانے ملی جلی مشرق و مغربی تہذیب بلکہ صحیح معنوں میں اسلامی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں آج کل کے لحاظ سے متروک الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔

غلام فرید حسینی کے مضمون میں انتظار حسین کے افسانے "پنجرہ" کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مضمون میں تہذیب کے ساتھ جڑے رہنے کو اعلی قدر سمجھا گیا جب کہ زر پرستی کے چکر میں اپنی تہذیب کو چھوڑنے کو اخلاقی زوال سے جوڑا گیا ہے۔ اپنی تہذیب، اپنے اقدار سے جڑے رہنے سے ہی انسان اپنی جون میں بر قرار رہ سکتا ہے۔ مشرق و مغرب کو روحانیت اور مادیت کے تناظر میں بھی دیکھا گیا ہے افسانے کے مطابق روحانیت کو چھوڑ کر مادیت پرستوں کی گروہ میں شامل ہونے والے ہمارے ہم جنس نہیں ہوسکتے۔یوں غلام فرید حسینی کے مطابق:

"اور یہ تو انتظار حسین کا مرغوب موضوع ہے کہ انسان جب بھی کسی اخلاقی زوال کا مرتکب ہوتا ہے تو پھر وہ اپنی جون میں برقرار نہیں رہ سکتا۔ انسان وہ ہے جو مہذب ہے اور تہذیب روحانیت کی علمبردار ہے۔"(۱۰۹)

نفسیات:

۲۰۱۵ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک کے ادبی مجلوں میں افسانوں پر پانچ مضامین میں نفسیاتی لحاظ سے بحث ملتی ہے۔ جن میں ممتاز مفتی کے افسانے خدیجہ مستور کا افسانہ "راستہ"، سجاد حیدر یلدرم کا "خارستان و گلستان" ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی کے افسانے اور بیدی کالاجونتی شامل ہے۔ حامد رضا صدیقی کے مطابق:

"جنس اور جنسی نفسیات مفتی کا مرغوب ترین موضوع ہے، جنس اور اس کی خواہش ہماری فطرت اور جبلت میں شامل ہے لیکن ہم معاشرتی اور سماجی طور پر ایک ایسے نظام اور روایت کا حصہ ہیں جہاں اس کا ذکر تک شرافتوں کے نام و نہاد معیار کے منافی ہے نتیجہ جبر اور گھٹن مختلف ذہنی اور نفسیاتی عوارض و عوامل اور ابنارمل حرکات و سکنات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مفتی کے افسانوں میں بھی جنس نگاری کا یہی پہلو نمایاں ہے۔"(۱۱۰)

جنس ممتاز مفتی کے یہاں لطف اور تلذذ کی علامت نہیں بلکہ فرد کی شخصی تعمیر و تشکیل اور فطرت کو سمجھنے کے لیے جنس اور جنسی تجربات اہمیت کے حامل ہیں۔ یوں ممتاز مفتی انسانی نفسیات کے مختلف پہلو سامنے لاتے ہیں۔ افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" اور "آپا" کی عذرا اور آپا کے لیے محبت سماجی جکڑ بندیوں کی وجہ سے روگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ "مہندی والا ہاتھ" اور "ماتھے کا تل" میں مفتی کی اپنی نفسیات اور سوانح کا رنگ نمایاں ہے جس کا ثبوت "علی پور کا ایلی" پڑھ کر مل جاتا ہے۔ ایڈی پس کمپلیکس جو کہ نفسیات کا پہلو ہے مفتی کے نفسیات کا پسندیدہ پہلو ہے "ماتھے کا تل" میں بھی نمایاں ہے۔ "سیانی"، "خلط ملط"، "غسل آفتابی"، "مورا" اور "اندھا" جنسی نفسیات پر مبنی افسانے ہیں۔ نیز افسانہ "بدماش"، "جب اور اب"، "دام خیال" اور "زندگی" جنسی ناآسودگی، عورت کے مضطرب اور ناآسودہ جذبے، مرد و عورت کے جنسی خواہشات، جنسی کشمکش کے جذباتی و نفسیاتی مسائل پر مبنی افسانے ہیں۔

خدیجہ مستور کے افسانے "راستہ" کے مطابق فطری سماجی، معاشی اور سیاسی دباؤ انسان کے فطری تقاضوں کی راہ میں خلل ڈالتے ہیں لیکن یہ فطری تقاضے انسان کو بار بار اپنی جانب راغب کرتے ہیں۔ افسانے

کے نسوانی کرداروں کے حوالے سے ماں کے نفسیات اور عورت کے اس نفسیاتی پہلو کی جانب اشارہ ملتا ہے کہ جب عورت کسی ماحول کا حصہ بن جائے تو چاہنے کے باوجود بھی اس ماحول سے نکل نہیں پاتی اور اسے اس ماحول سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر "خارستان و گلستان" کو اردو میں جنس نگاری کے موضوع پر پہلا افسانہ قرار دیتے ہیں اگرچہ یہ افسانہ جنس کی روایت کو فروغ نہ دے سکا۔ طارق بن عمر کے مطابق "'خارستان و گلستان' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی خواہش ہے جہاں انسان ذہنی و جسمانی کیفیات کی پیچیدگیوں سے روشناس ہوتا ہے۔"(۱۱۱)

تقسیم ہند کے بعد مغویہ عورتوں کی بازیابی اور ان کی بساوٹ بیدی کے افسانے "لاجونتی" کا موضوع ہے۔ سندر لال، لاجونتی کو بسا تو لیتا ہے لیکن دیوی کا درجہ دے کر نہ کہ بیوی کا۔ اور ایک مستقل چپ اس کا احاطہ کر لیتا ہے جو کہ "انتہائے غم کا سبب ہی ہو سکتا ہے یا مرد ہونے کا جبلی احساس کہ میری بیوی سے کوئی غیر مرد میری طرح ہی لذت آشنا ہوا ہو گا اور وہ کرب اس وقت اور زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ غیر مرد مسلمان ہے"(۱۱۲)۔ لاجونتی جو کہ گوشت پوست کی انسان ہے وہ دیوی کی بجائے سندر لال کی پرانی لاجو بننا چاہتی ہے جب کہ اس واقعے کے بعد وہ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بے شوہری کی زندگی گزارتی ہے۔ آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتی ہے کہ "وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجو نہیں۔ وہ بس گئی پر اجڑ گئی"(۱۱۳)

کرشن چندر انسانی فطرت اور اس کی جبلتوں کو موضوع بناتے ہیں۔ نہ صرف انسانی رویوں کو بلکہ وہ جو کچھ وراثت میں حاصل کرتا اور ارد گرد ماحول جس طرح انسانی شخصیت کو متاثر کرتے ہیں ان سب کو موضوع بناتا ہے۔ معاشرتی جبر جس طرح جنسی پیچیدگیوں کا باعث بنتا ہے اس کی عکاسی بھی کرشن چندر کے یہاں ملتی ہے۔ عورت کے حوالے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ مرد عورت کی بدولت متحرک رہتا ہے اور یہ فطرت ہے جس سے انکار ممکن نہیں بلکہ ارتقا کا عمل عورت سے مشروط ہے۔ کرشن چندر نے چونکہ اپنا بچپن اور جوانی کشمیر میں گزاری۔ ان کے افسانوں کی منظر نگاری پر اس دور کے اثرات غالب ہیں۔

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی عورت کی شخصیت کے تمام رخوں، جذبات و احساسات اور تمام تر کیفیات کو اپنے افسانے "زہر ہی زہر"، "تجھے دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں"، "بند دروازہ"، "زندگی کا حسن"، "زخم کے بھرنے تلک"، "خزاں کی بہار"، "سچ کا آلاؤ" اور "فرض" میں بیان کیے ہیں۔

تانیثیت:

احمد رشید کے افسانوں کا ایک حوالہ تانیثی بھی ہے۔ انہوں نے عورتوں کے مسائل اور ان پر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھایا ہے۔ مرد اساس معاشرے میں عورتوں کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی مذمت ملتی ہے۔ ان کے یہاں عورت کے جذبات و احساسات، نفسیات و کیفیات کا بیان ملتا ہے انہوں جدید عورت کی سوچ، فکر اور فلسفہ تانیثیت کے پیچیدگیوں کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ تانیثیت کے حوالے سے بھی کیا گیا ہے۔ جس کے مطابق "سندرتا کاراکشس"، "ان پورنی"، "کھل بندھنا"، "اپسرا حویلی" متھ کی زبان میں جدید عورت کی سوچ، تانیثیت کے مسائل، Gender Equality, Women Empowerment کے موضوعات پر مبنی ہیں۔

جدیدیت:

جدیدیت کے حوالے سے ایک ہی مضمون میں انتظار حسین کے افسانوں پر بحث کی گئی ہے۔ جس کے مطابق انتظار حسین کا شمار قیام پاکستان کے بعد ان چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو افسانے میں نیا اسلوب نئے موضوعات اور نئی تکنیک کو رواج دیا۔ ہجرت کا موضوع انتظار حسین کے افسانوں کی اساس ہے۔ اس موضوع کے تحت لکھے گئے افسانے دکھاتے ہیں کہ کس طرح ایک جمی جمائی تہذیب انتشار کا شکار ہوئی۔ کس طرح ایک خوبصورت تہذیب کھنڈرات میں تبدیل ہوئی اور تتر بتر معاشرے کو تشکیک، عدم تحفظ اور بے چہرگی نے لپیٹ میں لے لیا۔ اس منظر نامے کے بیان کے لیے داستان کا علامتی و استعاراتی پیرایہ بیان اختیا کیا گیا۔ علامتوں کی تشکیل کے لیے لیے لوک اوہام جیسے کبوتر کی بزرگی، بندر کی قلب ماہیت، سفید پوش بزرگ، سبز پوش بزرگ، بڑکے درخت پر ٹیڑھی آنکھوں والے جن، رات کی تاریکی میں لمبے بالوں اور پیچھے مڑے ہوئے پیر والی بلا سے استفادہ کیا گیا۔ حامد رضا صدیقی کے مطابق:

> "انتظار حسین نے جدید عصر کی کج روی بیان کرنے کے لیے ان علامتوں کو ایک تناظر دیا ہے اور انہوں نے سبز پوش اور سفید پوش بزرگوں سے جو کبھی خوابوں، کبھی زندہ صورتوں میں نظر آتے تھے انوکھے ڈھب سے اپنی سوسائٹی پر منطبق کیا ہے۔"[۱۱۴]

تاثراتی طریقہ کار:

مضمون "گونجتی خاموشی" میں منٹو کے افسانوں پر بحث میں تاثراتی انداز بھی ملتا ہے جس کے مطابق منٹو اپنے افسانوں کے اختتامیہ پیراگرافس مؤثر بنانے کے لیے خاصی توجہ اور وقت صرف کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات انجام کو دیرپا اور پراثر بنانے کے لیے آخری جملوں کو بار بار دہراتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر نسیم اے

ہائز کے مطابق منٹو کے افسانے "کھول دو" اور "ٹھنڈا گوشت" ایسے ہی افسانے ہیں۔ان کے مطابق" دراصل ان دونوں بہت مؤثر افسانوں نے میرے دماغ پر گہرا اثر مرتب کیا۔ان دونوں کے انجام بہت ہی اثر انگیز ہیں اور قاری کی حسیات کو جکڑ لیتے ہیں"(۱۱۵)

تقابل

مضمون "گونجتی خاموشی" میں منٹو کے افسانے "کھول دو"، "ٹھنڈا گوشت" اور شیکسپیئر کے "اوتھیلو" کے تقابل سے یہ نکتہ سامنے لایا گیا ہے کہ "طاقت اور اختیارات کے غلط استعمال سے ہی المیے جنم لیتے ہیں"(۱۱۶)۔ جس طرح "کھول دو" افسانے میں رضاکار فرائض کی انجام دہی کی بجائے مہاجرین کے لیے مزید عذاب کا سبب بن جاتے ہیں۔اور "ٹھنڈا گوشت" میں ایشر سنگھ ہر طرح کی ظالمانہ کاروائیوں کے بعد کلونت کور کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے جبکہ "اوتھیلو" کا مرکزی کردار نامور جنگجو اپنی معصوم بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔دراصل ان کرداروں کی بے خوفی کی وجہ یہی ہے کہ یہ اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں اور ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔

اسلوب:

ڈاکٹر آصف الرحمان طارق کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ زیادہ تر اسلوب کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ ان مباحث کے مطابق ڈاکٹر آصف الرحمان افسانہ نگاری کو ایک نیا اسلوب دیتے ہیں وہ قدیم اردو میں جدید خیالات کو آسان الفاظ بڑی آسانی سے بیان کرتے ہیں۔ محاورہ، تشبیہ، استعارہ اور ٹکسالی زبان کا استعمال آصف الرحمان کے افسانوں کی خصوصیات ہیں۔زرین یٰسین کے مضمون کے مطابق "ڈاکٹر آصف الرحمان طارق کے افسانے جیسے "پاندان"، "جھلنگا پلنگ"، "امریکن لڑکی"، "گرتی دیواریں"، "اکیلا آدمی" وغیرہ اسلوب بیان اور سادگی کی عمدہ مثالیں ہیں"(۱۱۷)

ساختیات:

"احمد رشید کے افسانوں میں ساختیاتی نظام" کے عنوان سے احمد رشید کے افسانوی مجموعے "بائیں پہلو کی پسلی" پر تبصرہ ملتا ہے۔ساختیاتی نظام میں افراد اور اشیاء کو دیے گئی عنوانات محض Signs ہوتے ہیں جب کہ ان کے جلو میں معانی کی تہہ در تہہ کیفیات ملتی ہیں تمام معنی کے تجزیے کے بعد بالآخر حقیقی اور آخری معنی تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے یہی طریقہ کار احمد رشید کے افسانوں میں بھی اپنایا گیا ہے۔"کہانی بن گئی" کے

مطابق انسان کا کوئی بھی عمل دراصل اس کا ردعمل ہوتا ہے اور کہانی کار، کہانی میں اپنا ردعمل ہی پیش کرتا ہے۔یوں کہانی بن جاتی ہے۔"وٹینگ روم" میں دنیا کو وٹینگ روم سے تشبیہ دی ہے۔"بائیں پہلو کی پسلی" میں عورت کو جس طرح زندگی کے تمام شعبوں میں جنسی افتراق اور صنفی امتیازات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کی عکاسی ملتی ہے۔"بھورے سید کا بھوت" کے مطابق بھوتوں نے سنسنان علاقے چھوڑ دیے ہیں کیوں کہ اب انسان خود بھوت بن گئے ہیں۔"فیصلے کے بعد" میں آفتاب کے کردار کے ذریعے سے مرد اساس معاشرے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جبکہ شفق یعنی عورت ڈوبتی ہوئی کشتی کی مانند ہے۔"حاشیہ پر" کے مطابق ہندوستان میں اقلیت تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی ہر لحاظ سے حاشیے پر ہیں۔"ہاف بلڈ بوٹل" میں شوہر حاملہ بیوی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کبھی خون بیچتا ہے تو کبھی "پریکٹس فیملی پلاننگ" میں اپنے اسپرم بیچتا ہے۔"اندھے قانون" میں انصاف کا طلب گار ہی لالچ کے ہاتھوں اندھے قانون کا شکار ہو جاتا ہے۔

رومانیت:

طارق بن عمر افسانہ " خارستان و گلستان " کو رومانوی حوالے سے دیکھتے ہیں۔ان کے نزدیک افسانے میں رومانیت کے کئی پہلو مثلاً تخیل، وجدان، جذباتیت اور مصوری کے صورت میں سامنے آئے ہیں۔افسانے میں فطرت پرستی کا غلبہ اور نسرین نوش کا کردار انہی رومانوی عناصر پر مبنی ہے.

ب۔ناول پر مبنی آرٹیکل:

مابعد الطبیعات:

وقت:

تجزیاتی مطالعے کے تحت الاقرباء کے مضامین میں وقت کے تصور کے لحاظ سے ڈاکٹر گل ناز بانو کا ایک ہی مضمون ملتا ہے جس میں قرۃ العین حیدر کے ناول " آگ کا دریا" کا جائزہ لیا گیا ہے۔ڈاکٹر گل ناز بانو کے مطابق مصنفہ اس ناول میں وقت کو بنیاد بنا کر تمام واقعات اس سے منسلک کرتی ہیں اور وقت کے تصور کی وضاحت کے لیے ٹی ایس ایلیٹ کے نظم سے مدد لیتی ہیں۔ناول کے مطابق وقت ہی اصل حقیقت ہے جو کہ سب کو متاثر کرتا ہے لیکن خود ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔اسی وقت کی بدولت ہی گوتم، ودیارتی، مصور، بت تراش، گائیک، کلاکار، ڈرامہ نگار، ایسٹ انڈیا کمپنی کا ذمہ دار افسر، بیوروکریٹ اور سفارت کار بنتا ہے۔ڈاکٹر گل ناز بانو کے مطابق:

"یہ مسلم حقیقت ہے کہ وقت کا دریا اپنی تند و تیز لہروں کے باوجود بھی انسان کو نہیں لپیٹ سکتا وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ انسان وقت کی طرح مختلف روپ بدل کر آئے گا۔ وقت انسان کو ختم بھی کرتا ہے اور دوبارہ جنم بھی دیتا ہے۔ گویا کہ وقت اور انسان لازم وملزوم ہیں اسی لیے تو ناول کے آخر میں گوتم کہتا ہے کہ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں میں مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مجھے کوئی زخم نہیں لگے ہیں سالم ہوں مجھے کوئی ختم نہیں کر سکتا۔"(۱۱۸)

سیاسی وسماجی:

ترقی پسند فکر کے تحت لکھنے والی خدیجہ مستور ناول "زمین" میں ہجرت کے بعد کے سیاسی و سماجی مسائل کے بیان کے لیے ناول کے کردار ساجدہ سے کام لیتی ہیں۔ ساجدہ کا کردار دکھاتا ہے کہ کس طرح معاشرتی تشدد اور منفی رجحانات انسانی زندگی اور شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تہذیب:

الاقربا کے مضامین میں قراۃ العین حیدر کے ناولوں "میرے بھی صنم خانے"، "سفینہ غم دل"، "آگ کا دریا"، "آخر شب کے ہم سفر"، "کار جہاں دراز ہے"، "گردش رنگ چمن" اور "چاندنی بیگم" کا جائزہ تہذیبی تناظر میں لیا گیا ہے۔ اس جائزے کے مطابق قراۃ العین حیدر کی تمام کہانیاں اور کردار ہندوستانی مشترکہ تہذیب خاص طور پر لکھنؤ کی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔

تانیثیت:

مسائل نسواں کے حوالے سے عصمت چغتائی کے ناولوں "ضدی"، "ٹیڑھی لکیر"، "سودائی" اور "معصومہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے کے مطابق جہاں عصمت کے ناولوں میں ہمارے معاشرے کی بے بس عورت کا روپ بھی موجود ہے وہیں عورت کا وہ باغی روپ بھی ملتا ہے جو کہ سماج کے ان تمام فرسودہ رواج سے بغاوت کرتی ہے جہاں عورت کو دیوداسی، ستی ساوتری، رکھیل اور باندی سمجھا جاتا ہے حامد رضا صدیقی کے مطابق:

"عصمت اپنے ناولوں میں سماجی اور خارجی وقوعات کی بجائے عورتوں کے داخلی وقوعات پر زیادہ نظر رکھتی ہیں۔ ان کے ناول کے بیشتر کردار اپنی باطنی کیفیات اور تضادات کے

ساتھ اپنی ذات کا انکشاف کرتے ہیں۔ سماجی سطح پر سانس لینے کے باوجود وہ اپنے اندر زندہ رہتے ہیں۔ عصمت کے ناولوں کا مرکزی تجربہ عورت ہے۔"(۱۱۹)

ڈرامے پر مبنی آرٹیکل:

سماج:

ادبی مجلے "الاقرباء" میں پروفیسر حسن عسکری کاظمی "یادرفتگاں" میں اشفاق احمد خان کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے ڈرامے و افسانے کو پاکستانی سماج کے ادبی اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنی تخلیقات میں اعلیٰ اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی نمائندگی کی۔ پروفیسر حسن عسکری کے مطابق:

> "اشفاق احمد خاں کا وصف خاص یہ تھا کہ وہ قصے کہانی اور واقعے کے تمثیلی انداز اظہار کے پردے میں بہت کچھ کہنے کا ہنر رکھتے تھے۔ ان کے ڈرامے "ایک محبت سو افسانے" میں ان کے موضوعات تلخ حقائق پر مبنی ہوتے تھے کہ ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا کہ وہ بڑے پتے کی بات کر گئے ہیں۔"(۱۲۰)

ڈرامہ نگاری کے حوالے سے منو بھائی(منیر احمد قریشی) کے ڈراموں "سونا چاندی"، "آشیانہ"، "دشت"، "گم شدہ" اور "خوبصورت" کا ذکر ملتا ہے۔

ب۔ غیر افسانوی نثر پر مبنی تحقیقی و تنقیدی تحریریں

الف۔ سوانح عمری:

تاریخ:

مسلم شمیم، سید مظہر جمیل کی کتاب "ذکر فیض" کو بجا طور پر فیض احمد فیض کی پہلی سوانح عمری قرار دیتے ہیں بلکہ اسے سرسید احمد خان کی سوانح عمری "حیات جاوید" کی ہم پلہ سمجھتے ہیں کیوں کہ جس طرح "حیات جاوید" سرسید احمد خان کے حوالے سے انیسویں صدی کا سیاسی، سماجی، لسانی، نظریاتی، ثقافتی اور اقتصادی منظر نامہ اپنی جامعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے بالکل اسی طرح "ذکر فیض" بیسویں صدی بلکہ ماڈرن عہد کی تاریخ کو "فیض احمد فیض کے جہد حیات کی روشنی میں پیش کرتی ہے۔ سید منصور عاقل، مجاہد لاہوری کی مترجمہ کتاب "سچ سمندر" پر تبصرہ کرتے ہیں جو کہ ایڈمرل افتخار احمد سروہی کی آپ بیتی ہے جس کا انگریزی عنوان "TRUTH NEVER RETIRES" ہے۔ تیس ابواب پر مشتمل یہ خود نوشت سوانح عمری کم و

بیش نصف صدی کی قومی و بین الاقوامی تاریخی انکشافات پر مبنی ہونے کے ساتھ نئی نسل کے لیے ایک سبق آموز دستاویز ہے۔ سید منصور عاقل کے مطابق:

> ""سچ سمندر" جہاں ایک محب وطن سپاہی، صاحب بصیرت شہری اور ملک میں اعلی عسکری مناصب پر فائز ہمہ جہت شخصیت کی داستان حیات ہے بل کہ پاکستان کے نصف صدی سے زیادہ سیاسی، سماجی، معاشی مدوجذر پر مشتمل صداقت نامہ ہے اور آئندہ نسلوں کو کردار سازی کا درس بھی ہے۔"(۱۲۱)

ب۔ سفر نامہ

معاشرت / سماج، تہذیب، ثقافت:

ڈاکٹر شہاب الدین علی گڑھ "حج کے سفر ناموں میں حجاز کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نقوش" کے تحت حج کے سفر ناموں "سفر نامہ حجاز"، "سفر نامہ حج"، "حج خداد"، "ماہ مغرب"، "سفر نامہ عرب"، "زاد غریب"، "رفیق الحجاج"، "یادداشت تاریخ وقائع حج"، "سفر نامہ حجاز شام و مصر"، "رسالہ حج"، " سفر حرمین شریفین و ذکر مدینہ منورہ"، " زاد الدرین"، "سفر بیت اللہ"، "زاد السبیل"، "سفر نامہ حجاز"، مترجمہ "سفر نامہ حجاز"، "سفر حجاز" اور "سفر نامہ حرمین" کا مطالعہ بدوؤں کی قتل و غارت گری، بردہ فروشی، شراب نوشی، مکانات، طرز نشست و برخاست، لباس، قہوہ خانے، حمام، شادی اور طلاق، رسم بعد موت، رسم ختنہ، لڑکیوں کا ختنہ، معمولات رمضان، عید، مجلس مولود کے تناظر میں کرتے ہیں۔ نجیبہ عارف کی مرتبہ کتاب "سیر ملک اودھ" پر سید منصور عاقل نے تبصرہ کیا ہے جو کہ اردو میں یورپ کے پہلے سفر نامہ نگار یوسف خاں کمبل پوش کا "سیر ملک اودھ" دوسرا سفر نامہ ہے جس میں انہوں نے اودھ ریاست کے مختلف علاقوں اور گردونواح کے سفر کے حالات وواقعات قلم بند کیے ہیں۔

وطن پرستی:

سلمی اعوان کے سفر نامے "سیلون کے ساحل اور ہند کے میدان" میں وطن پرستی کا رجحان نمایاں ہے۔ وہ بیرون ملک جا کر تقابلی جائزے میں دوسرے ممالک کی شان و شوکت سے مرعوب نہیں ہوتی بلکہ اپنے وطن کی عظمت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتی ہے۔

تاریخ:

نعیم فاطمہ علوی، سلمی اعوان کی کتاب "عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں" پر تبصرہ کرتی ہیں کہ اپنے اس سفر نامے میں سلمی اعوان سفر روس کے دوران وہاں کے عالمی شہرت یافتہ تخلیق کاروں الیگزنڈر پشکن، لیو ٹالسٹائی، صوفیہ ٹالسٹائی، دوستو وسکی، انیا دستو وسکی، یونس ایمرے بروس پاسترنگ، مونا عمیدی کے ساتھ نزار قبانی، رابندر ناتھ ٹیگور، کرونیر تھن، سعدی یوسف، ابونواس، جان کیٹس، گوزیو کاروسی، محمود درویش کی شخصیت اور تخلیقات پر سیر حاصل تبصرہ کرتی ہیں۔ فضہ رسول "اردو ادب میں فن سفر نامہ نگاری۔۔۔ایک تعارفی مطالعہ "کے عنوان سے سفر نامہ نگاری کے ذیل میں "سفر نامہ ہند" سے شروع ہونے والے سفر ناموں کی فہرست فراہم کرتی ہیں جو کہ کچھ یوں ہے۔ یونانی سیاح میگا سیتھنز کا سفر نامہ "سفر نامہ ہند" حکیم ناصر خسرو کا "زاد المسافرین (اردو ترجمہ بعنوان سفر نامہ حکیم ناصر خسرو)"یوسف خان کمبل پوش کا "تاریخ یوسفی" نواب کریم خان کا "سیاحت نامہ "سید فدا حسین کا "تاریخ افغانستان "محی الدین علوی کا "سفیر اودھ "واجد علی شاہ کا "شام اودھ "کے سفر نام شامل ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں سامنے آنے والے سفر ناموں میں سر سید کا "مسافر ان لندن "اور "سفر نامہ پنجاب "محمد حسین آزاد کا "سیر ایران "شبلی نعمانی کا "روم و مصر و شام "نواب حامد علی خان کا"سیر حامدی "اور ڈاکٹر شاہ علی سبزواری کا سفر نامہ "خوف ناک دنیا"شامل ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں منظر عام پر آنے والے سفر ناموں میں منشی محبوب عالم کے دو سفر نامے "سفر نامہ یورپ "اور "سفر نامہ بغداد "ڈاکٹر محمد حسین کا "۱۹۰۷ کا جاپان "عطیہ فیضی کا "زمانہ تحصیل "شیخ عبد القادر کا "سفر نامہ مقام خلافت "اور "سیاحت نامہ یورپ "خواجہ غلام ثقلین کا "روزنامچہ سیاحت "قاضی عبد الغفار کا "نقش فرنگ "مولانا عبید اللہ سندھی کا "کابل میں سات سال "بیگم حسرت موہانی کا "سفر حجاز "نواب محمد ظہیر الدین کا "سیاحت نامہ "عبد الصمد کا "سفر نامہ صارم "سید سلمان ندوی کا "سیر افغانستان "اور خواجہ احمد عباس کا سفر نامہ "ساز کی ڈائری "شامل ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کے سفر ناموں میں محمود نظامی کا "نظر نامہ "جمیل الدین عالی کے سفر نامے "دنیا مرے آگے "اور "تماشا مرے آگے "ضیاء القادر بدایونی کا "دیار نبیؐ "امیر خانم کا "میرا سفر "خدا بخش مسافر کا "منزلیں "فضل الدین کا "دیار حبیب کی باتیں "محمد ظہیر الدین صدیقی کا "امریکہ کے تاثرات "عزیز بیگ کا "یہ امریکہ ہے "نسرین بانو اکرام کا "الویت "ڈکٹر منظور ممتاز کا "ارض حافظ و خیام "طفیل احمد کا "سفر ماسکو "عبد الحمید خان کا "سفر نامہ مقامات مقدسہ "جمیل صبا کا "سفر ہے شرط "خلیل احمد حامدی کا "ترکی قدیم و جدید "قراۃ العین حیدر کا "جہان دیگر "، "ستمبر کا چاند "، "گل گشت "، "کوہ دماوند "اور "دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار "مقبول بیگ

بدخشانی کا" سرزمین حافظ و خیام" شفیق الرحمان کا" دجلہ" جمیل الزماں کا" چیستان چین" کوثر نیازی کا" ایک ہفتہ چین میں" جمیل زبیری کا" دھوپ کنارہ" مرزا ادیب کا" ہمالہ کے اس پار" محمد حمزہ فاروقی کا" آج بھی اس دیس میں" ڈاکٹر وزیر آغا کا" ایک ملاقات" اشفاق احمد کا" سفر در سفر" رفیق ڈوگر کا" اے آب رود گنگا" بشریٰ رحمان کا" براہ راست" مولانا محمد زکریا کا" سفر نامہ افریقہ و انگلینڈ" شوکت علی شاہ کا" اجنبی اپنے دیس میں" جلال الدین صدیقی کا" زیتون کے سائے" انتظار حسین کا" زمین اور فلک اور" اور" نئے لوگ پرانی بستیاں" ممتاز مفتی کا" لبیک"، "شاہراہ ریشم" اور" ہندیاترا" عرفان علی شاد کا" قدم بہ قدم" ذوالفقار احمد تابش کا" جوار بھاٹا" عبد السلام خورشید کا" رو میں رخش عمر" ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا" دید و باز دید" سید مبارک شاہ کا" برگد کی دھوپ میں" پروین عاطف کا" کرن، تتلی اور بگولے" سلمٰی اعوان کا" یہ میرا بلتستان"، "میرا گلگت و ہنزہ" اور" مصر میرا خواب" اور حسن عباسی کا" محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو" اور" ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا" شامل ہیں۔ سید منصور عاقل ۱۸۲ صفحات اور ۲۲ ابواب پر مبنی سفر نامہ" وادی کشمیر" کو بھی تاریخی دستاویز قرار دیتے ہیں۔ سلمی اعوان بھی اپنے سفر نامے" سیلون کے ساحل ہند کے میدان" میں خطہ زمین کو تاریخی حوالے سے دیکھتی ہیں۔ جمیل الدین عالی اپنے سفر ناموں میں لفظی مرقع نگاری سے قارئین کو ان تمام مقامات کی سیر کراتے ہیں نیز حقیقی منظر نامہ ہی نہیں دکھاتے بل کہ ان مقامات کے تاریخی پس منظر، اقوام کے عروج و زوال سے بھی آگاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔

ج۔ طنز و مزاح:

سماج:

ڈاکٹر قراۃ العین طاہرہ اکیس مضامین پر مبنی کتاب" شام شعر یاراں" پر تبصرہ مشتاق احمد یوسفی کے لفظ بافی و لفظ گری، یاد نگاری، اور عصر حاضر کی بوالعجبیوں، نیرنگیوں، کج رویوں، اور خامیوں کے تلخ ترش اور شیریں بیانی کے حوالے سے کرتی ہیں۔

تاریخی و سوانحی طریقہ کار:

اردو ادب میں طنز مزاح کے روایت کے استحکام کے سلسلے میں مرزا اسد اللہ خان، اودھ پنچ کے لکھنے والوں یعنی منشی سجاد حسین، احمد علی شوق، ستم ظریف، رتن ناتھ سرشار، اکبر آلہ آبادی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، شفق خواجہ، سید محمد جعفری، دلاور فگار، رضا

نقوی، چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ابراہیم جلیس، شفیق الرحمان اور محمد طفیل کا ذکر کیا گیا ہے۔ صحافتی طنز و مزاح کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی، ابراہم جلیس، شوکت تھانوی، مستنصر حسین تارڑ، مشفق خواجہ، بشریٰ رحمٰن، عباس اطہر، عزیز احمد، شاکر حسین شاکر، ظفر اقبال، اسرار بخاری، وقار انبالوی، مشکور علی، اخلاق احمد خان اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورق کا ذکر کیا گیا ہے۔ شعری طنز و مزاح کے حوالے سے اقبال، ظریف لکھنوی، سید ضمیر جعفری، سٹر دہلوی، انور مسعود، اسد جعفری، محمد ممتاز، راشد اور نیاز سواتی کا جب کہ عوامی طنز و مزاح کے حوالے سے جاوید اقبال، سہیل چوہدری، رضا الرحمان، مزمل اقبال، ساجد قریشی اور سید شوکت اعجاز کا ذکر ملتا ہے۔

د۔ کالم نویسی:

معاشرت / سماج:

کالم نویسی کے ذیل میں الاقرباء کے مجلے میں احمد ندیم قاسمی پر لکھے گئے مضامین کے مطابق امروز"، "ہلال پاکستان"، "احسان لاہور"، "روزنامہ جنگ کراچی"، "روزنامہ حریت کراچی" اور "روزنامہ جنگ" میں احمد ندیم قاسمی کے لکھے گئے فکاہیہ کالموں کا سلسلہ ۴۳ برسوں پر محیط ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے سیاست، معیشت، معاشرت، ادب و فن غرض ہر موضوع پر لکھا اور انداز ہمیشہ مصلحانہ اور مقصدی ہی رہا۔ ان کے یہاں مزاح برائے اصلاح پر زور ملتا ہے۔ عوامی مسائل خاص طور پر کراچی، لاہور اور سرگودھا کے نچلے اور متوسط طبقے کی زبان و مسائل کا بیان ملتا ہے۔ حامد رضا صدیقی احمد ندیم قاسمی کے موضوعات کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> " ان کے ہر مضمون میں اصلاح معاشرہ کی کوشش ہوتی ہے اوران معاشرتی برائیوں کی نشاندہی بہت شگفتہ انداز میں کرتے ہیں۔ انہوں نے رشوت، لوٹ مار، چوری، ملاوٹ، بد عنوانی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے واقعات کو قاری کے لیے عمدہ مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ "(۱۲۲)

جب کہ جمیل الدین عالی نے روزنامہ "جنگ" کے اخباری کالم "نقار خانے میں" سماجی اور معاشرتی مسائل پر قلم اٹھا کر اصلاح احوال کی سعی کی۔ منو بھائی (منیز احمد قریشی) "مساوات" اخبار میں "گریبان" کے نام سے

ترقی پسندانہ خیالات کے تحت غربت بے روزگاری، ناداری، انصاف کشی، طبقاتی ناہمواری، معاشرتی زندگی کے تضادات، عمرانی مسائل، دہشت گردی وغیرہ پر کھل کر لکھا ہے۔

حوالہ جات

۱. تحسین بی بی،ڈاکٹر،احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں آزادی سے پہلے کے افسانوں میں سیاسی شعور(مضمون)، مشمولہ ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، شمارہ۱۰۸، ۲۰۱۶ء ص ۲۵۰۔

۲. تحسین بی بی،ڈاکٹر،عبداللہ حسین کے افسانوں میں سیاسی شعور(مضمون)،ایضا،شمارہ ۱۱۶۔۱۱۷، ص ۵۱۳۔

۳. روبینہ شاہین(ڈاکٹر)،احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی مختلف جہتیں(مضمون)،ایضاً، شمارہ۱۰۸، ۲۰۱۶ء، ص ۲۳۲۔

۴. فتح محمد ملک، پروفیسر، اردو افسانہ نگاری میں ندیم کا مقام، ایضا، ص۱۵۶۔

۵. انوار احمد،ڈاکٹر،عبد اللہ حسین اداس نسلوں کے لیے کہانیاں(مضمون)،)،ایضا،شمارہ ۱۱۶۔۱۱۷، ص ۴۸۳

۶. ذوالفقار احسن، انتظار حسین بحیثیت افسانہ نگار (مضمون)، ایضا، شمارہ ۱۱۱۔ ۱۱۲، ۲۰۱۷ء

۷. محمد زاہد حسن، انتظار حسین کے فن پر ان کے ابتدائی زندگی کے نقوش (مضمون) ایضا، ص ۳۵۱

۸. ضیاءالمصطفی ترک، انتظار حسین کی کہانیاں (مضمون)، ایضاً، ص۳۸۸۔

۹. صابر حسین جلیسری، ڈاکٹر، انتظار حسین کی افسانہ نگاری، (مضمون)، ایضا، ص ۳۹۲۔

۱۰. انیس اکرام فطرت، عبد اللہ حسین کا ایک افسانہ "سمندر (مضمون)، شمارہ۱۱۶۔۱۱۷، ص۴۹۶

۱۱. اقبال آفاقی،ڈاکٹر،انتظار حسین:تہذیب معانی اور تجربہ(مضمون)،ایضا،شمارہ ۱۱۱۔۱۱۲، ۲۰۱۷ء، ص۲۷۶۔

۱۲. ایضا، ص۲۷۹

۱۳. ناصر عباس نئیر (ڈاکٹر)، انتظار حسین کے افسانے کا پس نوآبادیاتی تناظر (مضمون)، ایضاً، ص۳۱۶

۱۴. ناہید قمر، ڈاکٹر، انتظار حسین کا تصور تہذیب (مضمون)، ایضا، ص ۳۷۳۔

۱۵. گل عباس اعوان، ڈاکٹر، احمد ندیم قاسمی کے افسانے کا فنی و فکری تجزیہ، ایضا، ص ۴۳۱۔

۱۶. محمد ملک (پروفیسر)، اردو افسانہ نگاری میں ندیم کا مقام (مضمون)، ایضا، شمارہ۱۰۸، ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۲۔

١٧. محمد عاصم بٹ،افسانے کی روایت کا اگلا پڑاؤ(مضمون)،ایضا، شمارہ ١١١۔١١٢، ٢٠١٧ء، ص٣٤٣۔٣٤٤

١٨. امجد طفیل،ڈاکٹر،اردو ناول ١٩٤٧ سے ١٩٩٩ءتک (مضمون) مطبوعہ:ادبیات،شمارہ ١٢١-١٢٢، ٢٠١٩، اکادمی ادبیات پاکستان،ص٣٥٤۔

١٩. عارف حسین،انتظار حسین بہ حیثیت افسانہ نگار(مضمون)مطبوعہ:ادبیات،شمارہ١١١-١١٢،٢٠١٧ء، ایضا،ص٢٦٩۔

٢٠. سید زبیر شاہ،ڈاکٹر،اردو ناول کی روایت میں خیبر پختون خواہ کا کردار،(مضمون) مطبوعہ:ادبیات،شمارہ١٢١-١٢٢،٢٠١٩،ایضا،ص٥٤٠۔

٢١. محمد حمید شاہد،گزشتہ چند برس اور اردو ناول،(مضمون)مطبوعہ :ادبیات،شمارہ١٢٣-١٢٤، ٢٠٢٠ء،ایضا،ص٢٩۔

٢٢. ایضا،ص٢٩-٣٠۔

٢٣. خالد جاوید،کچھ قبض زماں کے بارے میں،(مضمون)ایضا،ص٣٥۔

٢٤. ایضا،ص٣٨۔

٢٥. سراج منیر،قراۃالعین حیدر:ایک مطالعہ،(مضمون)ایضا،شمارہ١٢١۔١٢٢،٢٠١٩ء،ص٣٧٧۔

٢٦. عرفان احمد عرفی،عاصم بٹ کے دو ناول "ناتمام" اور "بھید" بارے کچھ تاثرات (مضمون)، ایضا،شمارہ١٢٣-١٢٤،ص٨٣۔

٢٧. امجد طفیل،ڈاکٹر،اردوناول اکیسویں صدی میں(مضمون)،ایضا،ص٩٧۔

٢٨. نثار ترابی،ڈاکٹر،عبد اللہ حسین کے نادار لوگ،(مضمون)،ایضا،شمارہ١١٦-١١٧، ٢٠١٨ء،ص٢١٧۔

٢٩. سبینہ اویس اعوان،ڈاکٹر،عبداللہ حسین کی ناول نگاری،(مضمون)ایضا،ص٢٩٤۔

٣٠. آصف فرخی،ڈاکٹر،ناول اور ہمارے سماجی و تہذیبی رویے،(مضمون)ایضا،شمارہ١٢٢-١٢٢، ص٢٩۔

٣١. نیلم فرزانہ،خواتین میں ناول نگاری کا رجحان اور ابتداء،(مضمون)،ایضا،ص٢١٣۔

٣٢. عبدالسلام،پروفیسر، تقسیم کے بعد اردوناول،(مضمون)،ایضا،ص٣٠٤۔

۳۳. امجد طفیل،ڈاکٹر،اردو ناول:۱۹۴۷ سے ۱۹۹۹ء تک،(مضمون) ایضا،ص۳۴۷۔

۳۴. ایضا۔ص۳۴۸۔

۳۵. فیصل ریحان،بلوچستان میں اردو ناول کی روایت،(مضمون)،ایضا،ص ۵۳۰۔

۳۶. مبین مرزا،اکیسویں صدی کے دو عشروں کے ناولوں کا اجمالی جائزہ،(مضمون)،ایضا،شمارہ ۱۲۳-۱۲۴،ص۵۱۔

۳۷. ایضا۔ص۵۵۔

۳۸. امجد طفیل،ڈاکٹر،اردو ناول اکیسویں صدی میں،(مضمون)،ایضا،شمارہ،۱۲۳-۱۲۴،ص۱۰۱۔

۳۹. شاہد نواز،ڈاکٹر، اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں مقامیت کی دل آویز تشکیل، (مضمون)، ایضا،ص۱۰۹۔

۴۰. سید زبیر شاہ،ڈاکٹر،اردو ناول کی روایت میں خیبر پختونخوا کا کردار، مضمون،ایضا،شمارہ۱۲۱-۱۲۲،ص۵۳۵۔

۴۱. پروفیسر مزمل حسین،ڈاکٹر،اداس نسلیں شناختی بحران کا مسئلہ،(مضمون)،ایضا،شمارہ۱۱۶-۱۱۷، ص۲۵۰۔

۴۲. مشرف عالم ذوقی،۱۹۸۰ء کے بعد اردو ناول تعارف موضوعات،(ایضا)،شمارہ۱۲۱-۱۲۲،ص ۱۵۴۔

۴۳. فرید حسینی،ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ کے ناول "خس و خاشاک زمانے کا تہذیبی مطالعہ، ایضا، شمارہ۱۲۳۔۱۲۴،ص۲۴۶۔

۴۴. اظہر حسین،خالد محمد فتح کا فکشن،(مضمون) ایضا،ص۱۳۳۔

۴۵. سبینہ اویس اعوان، ڈاکٹر ،عبد اللہ حسین کی ناول نگاری(مضمون)،ایضا،شمارہ۱۱۶-۱۱۷،ص۳۰۱۔

۴۶. ملک محمد یونس،اداس نسلیں کا سیاسی پس منظر،(مضمون)،ایضا،ص۴۵۰۔

۴۷. مشرف عالم ذوقی / ۱۹۸۰ء کے بعد کے اردو ناول،تعارف، نئے موضوعات،جائزہ،(مضمون) ایضا،شمارہ۱۲۱-۱۲۲،ص۱۵۵۔

۴۸. عبد اسلام،پروفیسر، تقسیم کے بعد اردو ناول،(مضمون) ایضا،ص۳۱۱۔

۴۹. ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، خوشیوں کا باغ ایک تجزیہ، (مضمون) ایضا، شمارہ ۱۲۳-۱۲۴، ص ۱۵۱۔

۵۰. خالد اقبال یاسر، وحید احمد کا زینو اور زمانہ، (مضمون) ایضا، ص ۱۷۷۔

۵۱. اسلوب احمد انصاری، اداس نسلیں، (مضمون) ایضا، شمارہ ۱۱۶-۱۱۷، ص ۱۷۔

۵۲. ایضا، ص ۸۹۔

۵۳. ایضا، ص ۹۹۔

۵۴. خالد محمود، عورت، جنس اور عبد اللہ حسین، (مضمون)، ایضا، شمارہ ۱۲۱-۱۲۲، ص ۴۸۱۔

۵۵. مبین مرزا، تنہائی کے صحرا کی مسافت (عبد اللہ حسین کا تخلیقی تناظر)، (مضمون) ایضا، ص ۴۰۳-۴۰۴۔

۵۶. ایم خالد فیاض، اردو ناول، ۱۹۰۰ تا ۱۹۴۷ تک، (مضمون) ایضا، ص ۲۳۴۔

۵۷. محمد فیصل، اردو ناول کا نگار خانہ: آغاز سے ۱۹۴۷ء تک، (مضمون) ایضا، ص ۲۴۲۔

۵۸. امجد طفیل، ڈاکٹر، اردو ناول: ۱۹۴۷ سے ۱۹۹۹ء تک، (مضمون) ایضا، ص ۲۳۹۔

۵۹. ایضا، ص ۳۵۳

۶۰. ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر، گرگ شب: تجزیہ، (مضمون) ایضا، ص ۳۸۲۔

۶۱. سید زبیر شاہ، ڈاکٹر، اردو ناول کی روایت میں خیبر پختون خواہ کا کردار، (مضمون) ایضا، ص ۵۴۰۔

۶۲. مبین مرزا، اکیسویں صدی کے دو عشروں کے ناولوں کا اجمالی جائزہ، (مضمون)، ایضا، شمارہ ۱۲۳-۱۲۴، ص ۷۷۔

۶۳. اظہر حسین، خالد محمد فتح کا فکشن، (مضمون)، ایضا، ص ۱۳۲۔

۶۴. نجیبہ عارف، ڈاکٹر، بے وفا شہر کا قصہ گو، اصغر ندیم سید، (مضمون)، ایضا، ص ۱۹۰۔

۶۵. محمد عباس، نادار لوگ، (مضمون)، ایضا، شمارہ ۱۱۶-۱۱۷، ص ۲۴۵۔

۶۶. اسلم سحاب ہاشمی، لندن کی ایک رات میں رد استعماریت کے عناصر، (مضمون) ایضا، شمارہ ۱۲۱-۱۲۲، ص ۲۹۸۔

۶۷. منیر فیاض، عالمی افسانوی بیانیے کا اجمالی ارتقا اور انواسی، (مضمون)، ایضا، شمارہ ۱۲۳۔۱۲۴، ص ۳۵۵۔

۶۸. ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان،عبد اللہ حسین کی ناول نگاری،(مضمون)،ایضا،شمارہ ۱۱۶۔۱۱۷، ص۳۰۵۔

۶۹. طارق ہاشمی،ڈاکٹر، تین ناول: تین گزارشات،(مضمون)،ایضا،شمارہ۱۲۱۔ ۱۲۲، ص ۲۷۔

۷۰. نورالحسنین،اردوناول کی ایک صدی،(مضمون)،ایضا،ص۱۹۱۔

۷۱. مشرف عالم ذوقی،۱۹۸۰ء کے بعد کے اردو ناول،تعارف،نئے موضوعات،جائزہ، (مضمون)،ایضا،ص۱۶۹۔

۷۲. شہزادمنظر،پاکستان میں اردوناول،(مضمون)،ایضا،ص۳۴۰۔

۷۳. فخرالکریم،ڈاکٹر،اکیسویں صدی میں اردوناول:چند مباحث،(مضمون)،ایضا،شمارہ۱۲۳۔ ۱۲۴، ص۵۵

۷۴. عرفان احمد عرفی،عاصم بٹ کے دو ناولوں نا تمام اور بھید بارے کچھ تاثرات،(مضمون)، ایضا،ص۸۲۔۸۳

۷۵. ممتازاحمد خان،ڈاکٹر،"آگے سمندر ہے"کامنظرنامہ،(مضمون)ایضا،شمارہ۱۱۱۔ ۱۱۲، ص۱۹۸

۷۶. محمد زماں ظامی،عبد اللہ حسین کے ناولوں میں فلسفہ وجودیت،(مضمون)،ایضاشمارہ۱۱۶۔۱۱۷، ص۴۵۶۔

۷۷. نورالحسنین،اردوناول کی ایک صدی،(مضمون)،ایضا،شمارہ۱۲۱۔ ۱۲۲، ص۱۸۳

۷۸. شہزادمنظر،پاکستان میں اردوناول،(مضمون)،ایضا،ص۳۳۸۔

۷۹. امجد طفیل،ڈاکٹر،اردوناول اکیسویں صدی میں،(مضمون)ایضاشمارہ۱۲۳۔ ۱۲۴، ص۸۷۔

۸۰. اقبال آفاقی، ڈاکٹر ،اداس نسلیں کا مرکزی کردار"نعیم " معنیات کے ایک نئے تناظر میں،(مضمون)، ایضا،شمارہ۱۱۶۔۱۱۷، ص۱۴۰۔

۸۱. نورالحسنین،اردوناول کی ایک صدی،(مضمون)،ایضا،شمارہ۱۲۱۔ ۱۲۲، ص۱۸۹۔

۸۲. مشرف عالم ذوقی،۱۹۸۰ء کے بعد کے اردوناول،تعارف،نئے موضوعات،جائزہ،(مضمون)، ایضا،ص۱۶۸۔

۸۳. نورالحسنین،اردوناول کی ایک صدی،(مضمون)،ایضا،ص۱۸۰۔

۸۴. ڈاکٹر امجد طفیل/اردو ناول: ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۹ تک،،(مضمون)، ایضا، شمارہ۱۲۱۔۱۲۲، ص۳۵۷۔

۸۵. انیس اشفاق، معاصر اردو ناول نئے تنقیدی تناظر (ہندوستانی ناول نگاروں کے حوالے سے)، (مضمون)، ایضا، شمارہ
۱۲۳۔۱۲۴، ص۱۰۔۱۱

۸۶. اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مرزا اطہر بیگ کا "غلام باغ"، (مضمون)، ایضا، ص ۳۱۴۔

۸۷. نجیبہ عارف، ڈاکٹر، بے وفا شہر کا قصہ گو اصغر ندیم سید، (مضمون)، ایضا، ص ۱۹۴

۸۸. یوسف نون، بہاؤ ایک ماحولیاتی پڑھت (مضمون)، ایضا، ص۲۷۹۔

۸۹. نبیل مشتاق، ناول "بستی" تیرہ صدیوں کی کہانی، (مضمون)، ایضا شمارہ ۱۱۱۔۱۱۲، ص۲۴۹۔

۹۰. دردانہ نوشین خان، ناول اور جغرافیائی ثقافت کے رنگ، (مضمون) ایضا، شمارہ۱۲۱۔۱۲۲، ص ۱۱۲۔

۹۱. مشرف عالم ذوقی، ۱۹۸۰ء کے بعد کے اردو ناول، تعارف، نئے موضوعات، جائزہ، ایضا، ص ۱۵۴۔

۹۲. خورشید ربانی، اردو کے اہم ناول: اجمالی جائزہ، (مضمون)، ایضا، ص ۲۰۱۔

۹۳. محمد عاطف علیم، آگ ایک جنت نظیر جہنم کی روداد، (مضمون)، ایضا، ص۲۸۹۔

۹۴. سید زبیر شاہ، ڈاکٹر، اردو ناول کی روایت میں خیبر پختون خوا کا کردار، (مضمون)، ایضا، ص۵۳۸۔

۹۵. شہزاد منظر، پاکستان میں اردو ناول، (مضمون)، ایضا، ص ۳۳۲۔

۹۶. نثار ترابی، ڈاکٹر، شوکت صدیقی بطور ناول نگار، (مضمون)، ایضا، ص ۴۳۳۔

۹۷. قاسم یعقوب، ناول میں نئی تکنیک اور تجربات، (مضمون)، ایضا، ص ۱۰۱۔

۹۸. ایضا، ص۱۰۱۔۱۰۲

۹۹. محمد عاصم بٹ، عبداللہ حسین اولین پاکستانی نثر نگار، (مضمون)، ایضا، شمارہ۱۱۶۔۱۱۷، ص ۱۶۳۔

۱۰۰. نور الحسنین، اردو ناول کی ایک صدی۔(مضمون)، ایضا، شمارہ۱۲۱۔۱۲۲، ص ۱۸۲۔۱۸۳۔

۱۰۱. غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، انتظار حسین بہ حیثیت ناول نگار، ایک ناقدانہ جائزہ، (مضمون)، ایضا، ص۴۲۱۔۴۲۲

۱۰۲. سید زبیر شاہ، ڈاکٹر، اردو ناول کی روایت میں خیبر پختون خوا کا کردار، (مضمون)، ایضا، ص۵۳۶۔

۱۰۳۔ محمد حمید شاہد، گزشتہ چند برس اور اردو ناول، (مضمون) ایضا، شمارہ ۱۲۳۔۱۲۴، ص ۲۲۔

۱۰۴۔ ایضا، ص ۲۴۔

۱۰۵۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، خوشبو کی ہجرت کا اسلوب بیان، (مضمون)، ایضا، ص ۱۶۸۔

۱۰۶۔ محمد فیصل، سید محمد اشرف: کہے کون صید رمیدہ سے ("نمبر دار کا نیلا" سے آخری سواریاں تک)، (مضمون) ایضا، ص ۳۶۴۔

۱۰۷۔ شگفتہ پروین، یاد گار حالی (مضمون) مطبوعہ ادبیات، شمارہ ۱۰۴، ص ۱۷۱۔۱۷۲

۱۰۸۔ عارف محمود کسانہ، بچوں کی سبق آموز کہانیاں (مضمون) مشمولہ الاقرباء، الاقربا فاؤنڈیشن، اسلام آباد، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۹ / جنوری۔مارچ ۲۰۲۰ء، ص ۱۴۳۔۱۴۴۔

۱۰۹۔ غلام فرید حسینی، انتظار حسین کا افسانہ "خالی پنجرہ" ایک مطالعہ (مضمون)، ایضا، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۷ء، ص، ۲۴۶۔

۱۱۰۔ حامد رضا صدیقی، ممتاز مفتی بحیثیت افسانہ نگار: ایک تنقیدی مطالعہ (مضمون)، ایضاً، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۴۔

۱۱۱۔ طارق بن عمر، سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ خارستان وگلستان ایک جائزہ، (مضمون)، ایضا، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۶ء ص، ۴۷۔

۱۱۲۔ احمد رشید، بیدی کی لاجونتی میں سندرلال کا نفسیاتی کرب (مضمون)، ایضا، سالنامہ ۲۰۱۹ء، ص ۱۲۵۔

۱۱۳۔ ایضا، ص ۱۲۳۔

۱۱۴۔ حامد رضا صدیقی، اردو افسانے کا مہادیو (مضمون)، ایضا، جنوری تا جوان ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۸

۱۱۵۔ پروفیسر نسیم اے ہاشز (ڈاکٹر)، گونجتی خاموشی (سعادت حسن منٹو۔ایک لازوال افسانہ نگار)، مترجمہ محمد طارق علی خان، مشمولہ الاقرباء، جنوری۔مارچ / اپریل۔جون ۲۰۱۵ء، ص ۵۹۔

۱۱۶۔ ایضا ص ۶۰۔

۱۱۷۔ سلطانہ مہر، ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق کے افسانے اور ٹکسالی اردو، مشمولہ الاقربا، ایضاً، ص ۲۵۵

۱۱۸۔ گل ناز بانو، ڈاکٹر، تصور وقت "آگ کا دریا" کے تناظر میں، (مضمون)، ایضا، شمارہ جنوری تا جون، ص ۳۰۱۔۳۰۲۔

۱۱۹.	حامد رضا صدیقی، عصمت کے ناولوں میں مسائل نسواں، (مضمون)، مطبوعہ الاقربا، شمارہ جنوری تاجون ۲۰۱۶ء، ایضا، ص۱۱۸۔

۱۲۰.	حسن عسکری کاظمی، پروفیسر، داستاں کہتے کہتے (مضمون)، ایضا، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء، ص۱۵۹۔

۱۲۱.	سید منصور عاقل، سچ سمندر (مضمون) ایضا، شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء، ص۲۲۸۔

حامد رضا صدیقی، اردو کالم نویسی میں قاسمی کا اختصاص (مضمون)، ایضا، شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص۱۱۵

باب سوم:

لسانیات اور تحقیق و تنقید پر مبنی مقالات / آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ

الف۔ ادبیات میں لسانیات پر مبنی آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر اسد اریب کے مطابق اردو زبان نے جہاں دیگر بہت سی زبانوں سے استفادہ کیا اور اس کے الفاظ اپنے اندر ضم کیے وہیں فارسی کے ساتھ تو اس زبان کا گہرا تعلق ہے جس کی ایک روشن دلیل یہ ہے کہ فارسی کے بہت سے روزمرہ آج بھی ہماری زبان کا حصہ ہیں اور نازک سے نازک خیالات کے اظہار میں استعمال ہوتے ہیں۔ڈاکٹر اسد اریب ایسے ہی فارسی روزمرہ کی فہرست مرتب کرتے ہیں جو کہ آج بھی اردو میں مستعمل ہیں۔

ڈاکٹر انصاف احمد شیخ کے مطابق فورٹ ولیم کالج کے تصنیف، تالیف اور تراجم کی تعداد ۱۴۷ ہے جن میں مطبوعہ ۹۴ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۵۳ ہے۔ تاہم اس کالج کی بدولت اردو نثر کو زیادہ فائدہ ہوا کیوں کہ اس کی بدولت عربی فارسی کے ادق اسلوب کی بجائے جدید نثر کی ابتدا ہوئی اور زبان سادہ سلیس، بامحاورہ اور روزمرہ کے قریب ہو گئی۔

ب۔ادبی مجلے "ادبیات" میں تحقیق و تنقید پر مبنی آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ بلحاظ افکار و طریقہ کار:

تصوف:

ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش "تصوف اور ادب کا باہمی تعلق" کے ذیل میں تصوف کیا ہے؟ادب کیا ہے؟ اور فنون لطیفہ کی شاخ کے حوالے سے ادب کی تعریف، ادبی اور غیر ادبی تحریر کا فرق، ادب اور تصوف کا باہمی ربط اور مزید تفصیل میں کروچے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کانٹ، ابو الا عجاز صدیقی، سلیم احمد، ایلیٹ اور حسن عسکری کے نظریات کے حوالے سے اس بحث کو آگے بڑھا کر اس نکتے پر ختم کرتے ہیں کہ:

> غرض یہ کہ ادب کی تخلیق و تنقید میں مابعد الطبیعات اور تصوف کی اہمیت مسلم ہے۔
> ادب کا تصوف سے بہت گہرا تعلق ہے۔ادب زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا بیان
> ہے تو تصوف ان پہلوؤں کی مثبت عملی تصویر ہے"[۱]

سماجی شعور:

ڈاکٹر نثار ترابی "ندیم کا تنقیدی شعور" کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی کے تنقیدی نظریات کو زیر بحث لاتے ہیں ان کے مضمون کے مطابق جس طرح احمد ندیم قاسمی کے افسانے گہرے سماجی شعور کے حامل ہوتے ہیں اسی طرح ان کی ناقدانہ تحریریں بھی سماجیات اور سماجی رویوں کی حامل ہوتی ہیں۔"وہ اس صنف ادب کو بھی سماج سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔انہوں نے خود بھی ادب کو سماج کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے"[۲]۔وہ اپنی تحریروں کے ذریعے روشن خیالی، وطن دوستی، علم پرستی، اعلی اقدار، آدمیت سے وابستگی اور قومی تقاضوں سے ہم آہنگی کو فروغ دیتے ہیں۔ڈاکٹر محمد امجد عابد، انتظار حسین کے مضامین "اجتماعی تہذیب اور افسانہ"، "نیا ادب اور پرانی کہانی"، "علامتوں کا زوال"، "رسم الخط اور پھول"، "ادب اور معاشرہ"، "نظریے سے آگے" کو مضمون میں زیر بحث لاتے ہیں۔ان کے مضمون کے مطابق راستی اور صاف گوئی پر مبنی انتظار حسین کا تنقید شعور ادبی جہتوں کے سمجھنے اور سمجھانے کے ساتھ گہرے عصری شعور نیز تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی حوالوں پر بھی مبنی ہے۔

حالی / مقدمہ شعر و شاعری:

کلیم احسان بٹ مضمون "عہد سرسید میں انگریزی اور حالی کی مقدمہ شعر و شاعری" کے عنوان سے حالی کی انگریزی سے ناواقفیت کے باوجود ان کی کتاب مقدمہ شعر و شاعری میں مستعمل انگریزی الفاظ، مغربی مصنفین کے خیالات، انگریزی کتابوں، نظموں اور اقتباسات کے ذرائع کا کھوج لگاتے ہیں کہ حالی کی رسائی اس سب تک کیسے ہوئی۔

نعیم راجہ کے مضمون "حالی کا تنقیدی شعور" کے مطابق الطاف حسین حالی کے نظم و نثر پر اصلاحی جذبے کا غلبہ نظر آتا ہے۔وہ شاعری کو سماجی اصلاح کے حوالے سے اہم جانتے تھے اور ہندوستانی معاشرے پر چھائے ہوئے جمود کی وجہ بھی روایتی شاعری کو گردانتے تھے۔مقدمہ شعر و شاعری الطاف حسین حالی کی انہی اصلاحی رجحانات پر مبنی ہے۔نعیم راجہ " مقدمہ شعر و شاعری " کے حوالے سے ہی حالی کے تنقیدی نظریات کی تشریح حالی کا تصور شعر، اچھی شاعری کی شرائط، شاعر کے خصائص، مطالعہ کائنات، الفاظ کی تلاش، اردو شاعری کے نقائص اور اصلاح تجاویز کے ذیل میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی کے ذیلی عنوانات سے نظریات کی تشریح کرتے ہیں۔

ایم خالد فیاض مضمون "وارث علوی کا حالی" میں وارث علوی کی کتاب "حالی، مقدمہ اور ہم" کو زیر بحث لاتے ہیں جس میں وارث علوی نے حالی سے متعلق کلیم الدین احمد، سلیم احمد اور شمیم حنفی کے اعتراضات سے بحث کی ہے۔ ایم خالد فیاض اس سلسلے میں وارث علوی کی کچھ نظریات کی تو تائید کرتے ہیں لیکن کچھ پر اعتراضات اٹھاتے ہوئے رائے دیتے ہیں کہ وارث علوی نے حالی پر ناقدین کے ضمن میں جا و بے جا دفاع کر کے دفاعی تنقیدے کے آخری حدوں کو چھو لیا ہے۔

متن کی تدوین:

پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد تدوین کے اصول اور اس سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا ذکر کر کے چند تجاویز بھی دیتے ہیں نیز تدوین جدید کے ذیل میں ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی کی مرتب کی ہوئی مثنوی سحر البیان، گلزار نسیم، باغ و بہار اور طلسم ہوش ربا: تنقید و تلخیص" کا ذکر کرتے ہیں۔ مضمون نگار رشید حسن خاں صاحب کی مرتب کی ہوئی مثنوی گلزار نسیم میں گل بکاؤلی سے متعلق ایک شعر پیش کرتے ہیں جس کی تصحیح ڈاکٹر قمر الہدیٰ کی مرتب کی ہوئی مثنویوں میں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر قمر الہدیٰ کے انہی کاوشوں کو سراہتے ہوئے پروفیسر صاحب کلاسیکی متون کی تدوین جدید کی سفارش کرتے ہیں۔

فلسفہ جمالیات:

ڈاکٹر اقبال آفاقی اڈورنو کے فلسفہ جمالیات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ اس بحث کے مطابق اڈورنو آرٹ برائے آرٹ کے قائل تھے اور آرٹ کے وہ نمونے جو معنی کی واضح شکل و صورت کے ساتھ ہمارے حسی تجربے کا حصہ بنتے ہیں آرٹ کہلانے کے مستحق ہیں۔ اڈورنو فلسفہ آرٹ میں معنی کی تشکیل میں نئے پن، اور یجنلٹی کی اہمیت اور Truth Content پر اصرار کرتے ہیں کیوں کہ ایسا آرٹ نہ صرف آنکھوں اور کانوں کو بلکہ ذہن کو بھی متاثر کرتا ہے اور انسان تعریف کیے بنا نہیں رہ پاتا۔ لیکن اس کے جمالیاتی تھیوری کو مابعد جدیدیت کے حامیوں کی جانب سے زبردست تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اقبال آفاقی کی پوری بحث اڈورنو کے فلسفہ جمالیات اور اس پر اٹھائے جانے والے اعتراضات کے گرد گھومتی ہے۔ ہیگل کے فلسفہ جمالیات میں روح مطلق کے ظہور کی تاریخی جدلیت کو اہمیت حاصل ہے۔ ہیگل تاریخی واقعات کو روح کے جدلیاتی ارتقا کے مطابق سمجھتا ہے اس کے مطابق دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ روح مطلق کی خود تکمیلیت کا جدلیاتی تسلسل

ہے اور آرٹ میں اس کا ظہور کم تر درجے کا ہوا ہے، وہ آرٹ کو روح کا مظہر قرار دیتا ہے بل کہ آرٹ وہ مقام ہے جہاں روحِ عالم جلوہ نما ہو سکتی ہے۔ آرٹ کا کام گرد و پیش کی نقالی نہیں بل کہ تفکر کی راہ پر لگانا ہے نیز

> آرٹ کا مقصد ذات کی سچائی کو ہماری ذات پر منکشف کرنا ہے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہم کون ہیں اور کیا مقام رکھتے ہیں۔ آرٹ کا مقصد آرٹ برائے آرٹ نہیں، آرٹ کا مقصد خوبصورتی کی تخلیق ہے اور انسانی ذات کی خود شناسی اور خود اظہاریت کو حسی ہئیت میں پیش کرنا ہے۔(۳)

کروچے کے جمالیاتی فلسفے کے مطابق آرٹ تخیل کی پیداوار ہے اور محاکات پر مبنی ہے۔ آرٹسٹ کا کام مکمل تمثال پیش کرنا ہے تا کہ اس کا نظارہ کیا جاسکے اور بنیادی طور پر یہی حسن اور خوبصورتی ہے۔ تخیل جو ذہنی اور داخلی تمثالوں کو خوبصورتی سے مرتب کرتی ہے۔ ان تمثالوں کی بنادی وجہ ہمارا وجدان ہی ہے اور وجدانی پیش کش شعور اور انکشاف کی آئینہ دار ہوتی ہے اور یہ تعقل سے پہلے کی کیفیت ہوتی ہے۔ عقل وجدان کو محاکے کا روپ دے کر تحریر کی سطح پر اظہار کرتا ہے۔ اور ہر ذہنی فعلیت میں احساس لازمی طور پر ہوتا ہے۔ مختصراً وجدانی علم اظہاری علم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی کروچے کے فلسفہ جمالیات کی وضاحت آرٹ اور جمالیات، وجدان اور اظہار، قدرتی حسن اور لذتیت، محاکمہ، تنقید اور ذوق، آرٹ کی شناخت اور زبان اور آخری عمر میں فکری تبدیلیوں کے ذیلی عنوانات سے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی اس تنقیدی جائزے کا خاتمہ اس نکتے پر کرتے ہیں کہ کروچے کے تفکر کی اہمیت اس نکتے میں پنہاں ہے کہ اس نے جمالیاتی ماہرین کی توجہ تاثر کی بجائے اظہار کی جانب مبذول کی جسے پہلے نظر انداز کیا گیا تھا۔

مادیت پسندی:

ڈاکٹر صلاح الدین درویش کے مضمون کے مطابق الطاف حسین حالی ملک کی ترقی کے لیے لائبریریوں کے قیام، اپنی مدد آپ، اجتماعیت پسندی، صنعت و حرفت اور تجارت کی سفارش کر کے مادیت پسند مفکر کے طور پر سامنے آتے ہیں نیز طبقاتی کشمکش کے خاتمے کے لیے اہلیت اور لیاقت کو اہمیت دیتے ہیں۔

اسلوب:

ڈاکٹر نثار ترابی کے مطابق الطاف حسین حالی کے ابتدائی نثری اسلوب کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ ان کے مطابق حالی کا ابتدائی نثری اسلوب قدیم نثر (جس میں عربی، فارسی کی کثرت ہوتی ہے) کا حامل ہے۔ جس پر جذباتیت، عقیدت مندی اور مذہبیت کا غلبہ ہے۔ اسی حوالے سے "مولود شریف"، "تریاق مسموم"، "پادری

عماد الدین کی تاریخ پر منصفانہ رائے"، "شواہد الہام"، "مجالس النسا" اور "تذکرہ رحمانیا" شامل ہیں جب کہ "مبادی علم جیالوجی" سائنسی موضوع پر ہے اور "اصول فارسی" قواعد پر مبنی کتاب کی زبان پرانے زمانے کی ہے جس میں نون غنہ، ہائے دو چشمی اور ہائے مجہول کا استعمال نہیں ملتا۔ ان، اس کی جگہ "اون"، "اوس" اور "گ" کی جگہ "ک"، "نے" کو "نی" اور "سے" کو "سی" لکھا گیا ہے۔ محمد حمید شاہد کا مضمون "تخلیقی عمل اور تازگی" میں تخلیق کار کے رواں زندگی سے انسلاک کے ساتھ زبان کے کردار کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ اسلوب ہی ہے جو کسی تخلیق کار کے تخلیق کو ایک خاص آہنگ دے کر ان میں تازگی اور توانائی کے امکانات پیدا کرتا ہے۔ محمد حمید شاہد کے مطابق:

> روایت سے اکتساب لفظ کو اگر تہذیبی معنیاتی سلسلے سے منسلک کرتا ہے تو تخلیق کار کے اپنے زمانے سے رشتے لفظ کو اس پر زم کے سامنے کر دیتے ہیں جس سے یہی معنیاتی سلسلہ تازگی، معنی کی توسیع اور نئی جمالیات کی دھنک اچھال دیتا ہے۔ (۴)

تاریخ:

تصنیم صنم کے مطابق پانی پت میں پیدا ہونے والے حالی کی شخصیت پر جہاں اس کے دور کے ماحول کا اثر نظر آتا ہے وہیں ان کے فن میں بھی اس کی شخصیت اور اس کے نظریات کی واضح عکاسی ملتی ہے جیسے کہ حالی نے اپنے دور کے نامی گرامی شعراء جیسے غالب، مومن، شیفتہ اور، بہادر شاہ ظفر اور آزردہ کی روش اختیار کی اور ان کی جانب سے پذیرائی بھی ملی لیکن جلد ہی ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی اور سر سید کی اصلاحی تحاریکوں سے متاثر ہو کر ملک و ملت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، مقدمہ شعر و شاعری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ حالی کی شخصیت کے اثرات ان کے لکھی ہوئی سوانح عمری خاص طور پر "حیات جاوید" میں بھی نظر آتے ہیں۔ حالی کے اسی انداز پر مہدی آفادی اظہار خیال کرتے ہیں کہ حیات جاوید ایک شریف انسان کی شریف انسان کے متعلق لکھی گئی سرگزشت ہے جس میں سر سید کی شخصی خامیوں کو جگہ نہ مل سکی۔

ادب اور اسلوبیات:

قاسم یعقوب مضمون "ادب اور اسلوبیات" میں اسلوب اور اسلوبیات کی وضاحت کے بعد اسلوبیاتی تنقید کے دائرہ کار کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس بحث میں کچھ نمونے کے سوالات بھی فراہم کرتے ہیں جو کہ دکھاتے ہیں کہ کب ادبی تنقید اسلوبیاتی تنقید کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے اور آخر میں فیض احمد فیض اور ترقی پسند شعراء کا اسی ضمن میں مطالعے کی طرف متوجہ کر کرتے ہیں۔

مابعد جدیدیت، لبرل علوم اور ڈی کنسٹرکشن:

ڈاکٹر صلاح الدین درویش کے مضمون کے مطابق:

> مابعد جدیدیت نظریاتی تفکر سے سر کھپانے اور انفس و آفاق کے بارے میں عقل محض کے ذریعے حتی آرا کے ظہور کی بجائے ان لبرل علوم پر فوکس کرتی ہے جن کی عملی سر گرمیوں کے نتیجے میں انسانی تمدن کو مادی وسائل کے ذریعے ترقی ملتی ہے (۵)

یوں مابعد جدیدیت نے قومی، نسلی، ثقافتی اور مذہبی مہابیانیوں پر سوالات اٹھانے کا طریقہ سمجھا کر نظریے کی موت کا اعلان کر دیا۔ ادبی متون کے مابعد جدید مطالعے اور تنقید کے لیے تین مرحلے پر مشتمل ڈی کنسٹرکشن طریقہ کار کی وضاحت اس لیے دی گئی ہے کیوں کہ:

> ڈی کنسٹرکشن متن میں موجود معنی کی وحدت، تحریری اسلوب، نظام مرکزیت، الفاظ، تراکیب اور جملوں' کی نشست، اہتمام اور سلیقے میں موجود ترتیب اور توازن کو توڑ دیتی ہے۔ متن کا نمائشی تعقل جس نفرت، تعصب اور تسلط کی خواہش دبا کر اسے تفکر، تدبر اور حکمت کا لبادہ اڑھا دیتا ہے۔ ڈی کنسٹرکش اس لبادے کو گھسیٹ کر پرے پھینک دیتی ہے اور متن کی دبائی میں اصل خواہش کو ننگا کر دیتی ہے وہ متن کی معنوی حتمیت اور حاکمیت کو توڑ دیتی ہے اور متن کا وہ معنوی تناظر سامنے لے آتی ہے کہ جسے متن کا بظاہر نمائشی تعقل دبانے مین کامیاب ہوتا ہے یوں صداقت پر نظریے، فلسفے یا کسی مہابیانیے کی اجارہ داری LOGOCENTRISM کو بھی توڑ دیا جاتا ہے۔ (۶)

انتظار حسین:

ڈاکٹر آصف فرخی، انتظار حسین کے حوالے سے قلم اٹھانے والے ناقدین جیسے حسن عسکری، ممتاز شیریں، سہیل احمد خان، نذیر احمد، مظفر علی سید، پروفیسر گوپی چند نارنگ، وحید اختر، انور عظیم، شمیم حنفی، شمس الرحمان فاروقی، وارث علوی اور محمد عمر کے کام کو زیر بحث لاتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر آصف فرخی نے نہ صرف انتظار حسین پر اعتراض اٹھانے والے ناقدین کو جواب دینے کی کوشش کی ہے بلکہ جنہوں نے تعریف کی ہے ان کا ذکر کرکے آگے بڑھ گئے ہیں نیز جنہوں نے انتظار حسین کو نظر انداز کیا ہے یا انہیں انتظار حسین

سے متعلق کسی کے کام میں کمی بیشی نظر آئی ہے اس کی نشاندہی کرتے ہیں انتظار حسین سے متعلق دستیاب تنقیدی سرمائے کی ضخامت کو انتظار حسین کے فن کی اعجاز سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید مضمون "انتظار حسین کی ادبی تنقید اور علامتی زوال کی حکایت" کے عنوان سے انتظار حسین کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب "علامتوں کا زوال" کے مضامین اور انتظار حسین کے تنقیدی نظریات کا تجزیہ کرتے ہیں ان کے مطابق جس طرح انتظار حسین فکشن میں قدیم اساطیر اور تلمیحات کا علامتی استعمال کرتے ہیں اور انسانی اخلاقیات کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں یہی انداز ان کے تنقیدی مضامین میں بھی ملتا ہے۔ڈاکٹر سعادت سعید کے مطابق "حقیقت یہ ہے کہ انتظار حسین کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ان کی مخصوص وضعداری، روایت پرستی، ماضی پرستی، عقیدہ نوازی کا پرتو لیے ہوئے ہے۔"(۷)

الف۔الاقرباء میں لسانیات پر مبنی آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ:

ادبی مجلے الاقرباء کے آرٹیکلز کا جائزہ تجزیہ مشتملات کے تحت لیا گیا۔اس جائزے میں لسانیات کے حوالے سے درج ذیل افکار و طریقہ کار سامنے آئے۔

املا/رسم الخط:

رسم الخط یا املا کے ذیل میں الاقربا کے مجلے کرامت بخاری، فائزہ فرمان اور شاہد رضا کے مضامین ملتے ہیں۔ کرامت بخاری کے مطابق اردو کا رسم الخط رومن کرنے کی سفارش دراصل اردو دشمنی ہے۔اس مضمون میں اس تبدیلی کے نتیجے میں اصوات، اوزان اور گرامر کے مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ فائزہ فرمان کے مضمون "اردو املا۔۔۔مسائل ور فتار" میں غلط العوام کے ضمن میں " قلفی، قفلی"، "بند"(Bun)، "چپراسی، چپڑاسی"، "دوپٹا"، "روپٹا"، "بے نیل و مرام"، "بے نیل مرام"، "اہلیان محلہ"، اہالیان محلہ یا اہالی"، " مُتَحن"، "ممتحِن"، "حواشی و تعلیقات" اور مذکر مونث کے ذیل میں "بلبل"، "گرھست" اور "گرھستی" وغیرہ کی بحث ملتی ہے جب کہ غلط العام کی ضمن میں کیجیئے، کیجیے، لکھیئے، لکھیے یا لکھئے، برائے مہربانی، براہ مہربانی، گرائمر، گرامر، طلباء، طلبا، آسامی، اسامی، دوئم، دوّم، سوئم، سوّم، امونیا، ایمونیا، سکول، اسکول، استعفیٰ استعفا، جناب عالیٰ، جناب عالی وغیرہ پر بحث ملتی ہے جب کہ دوسرے مضمون "خط اور رسم الخط کے بنیادی خدو حال" میں خط کی وضاحت کے بعد اس کی مختلف اقسام جیسے جام جمشید کے خطوط، خوش نویسوں کے خطوط، حکماء کے خطوط، نظر بد کے خطوط، علم سحر کے خطوط، اجرام فلکی کے خطوط، علم ہندسہ کے خطوط اور

دیگر خطوط میں خط الحاق،خط بیضوی،خط بریدہ،خط بر دیوار کشیدن،خط تواماں،خط دیوانی،خط طغریٰ،خط فاصل،خط چلیپا،خط پائے کلاغ،خط میخ،خط زیر نگین،اقلیدسی خطوط کی وضاحت کرتی ہیں جب کہ رسم الخط کے ذیل میں رسم الخط کے آغاز اور مختصر تاریخ کے بعد خط نسخ اور خط نستعلیق کو زیر بحث لایا گیا ہے۔شاہد رضا "اردو رسم الخط کا ارتقائی جائزہ" میں رسم الخط کا معنی و مفہوم،اردو رسم الخط کا بنیادی خط،اردو زبان کی وجہ تسمیہ،دیگر زبانوں سے حروف،اردو خط اور عربی خط کا موازنہ،اردو خط اور فارسی خط کا موازنہ،اردو خط اور ہندی خط کا موازنہ،اردو رسم الخط کی خوبیاں،اردو رسم الخط پر اعتراض،اردو رسم الخط کی طباعت،اردو نثر کی پہلی کتاب، قرآن مجید کا ترجمہ،جدید اردو نثر کی بنیاد اور اردو رسم الخط میں عبارت کے ابتدائی نمونے کے ذیلی عنوانات سے لیتے ہیں۔ عقیل دانش "سب رس" کی لسانی اہمیت کے متعلق رقم طراز ہیں کہ "سب رس" اس دور کی پیداوار ہے کہ جب اردو زبان کے اصول و قواعد متعین نہیں ہوئے تھے۔ عقیل دانش اس دور کی زبان میں مستعمل واحد جمع،، مونث مذکر، فعل حال،ماضی اور مستقبل کے سلسلے میں،ہائے ہوز، عربی الفاظ کی املا صوتی لحاظ، ہم صوت الفاظ کے قافیے کا قاعدہ،اردو اور فارسی میں مرکب توصیفی اور اضافی اور تکرار الفاظ میں تبدیلی کے حوالے سے مثالیں دے کر لکھتے ہیں کہ

> "سب رس" ایک ایسی لسانی دستاویز ہے جس کی روشنی میں لسانیات کا کارواں اپنی راہ متعین کرے گا اور نئے حرف ،نئے الفاظ اور نئی تراکیب کی وضع کے وقت دوسرے لسانی شاہکاروں کے ساتھ "سب رس" کو بھی سامنے رکھا جائے گا۔ (۸)

محمد فیصل مقبول عجز ،غالب کے اردو کلام کا مطالعہ سکتہ ،سوالیہ،فجائیہ،واوین،رابطہ اور تفصیلیہ کے حوالے سے کرتے ہیں۔ڈاکٹر عرفان شاہ نے شان الحق حقی صاحب کی ادارتی خدمات کا تنقیدی جائزہ "اردو نامہ" اور "ماہ نو" کراچی کے حوالے سے لیا ہے جس کے مطابق کثیر الموضوع مجلہ "اردو نامہ" میں کلیدی اہمیت زبان و لغت کے مسائل و مباحث کو ملی۔

ڈاکٹر عرفان کے مطابق:

> اس سلسلے میں زبان کے مخارج،اصلیت، محاورات،اصطلاحات،رشتہ لغات اور تحقیقات کو حکیمانہ طور پر جانچنے کے ساتھ ہی انہوں نے اردو نامہ میں عروض و فصاحت،تاریخ، افسانہ،خود نوشت اور دیگر موضوعات ادبی کو شامل کیا تا کہ پرچے کی حیثیت کو نقد ادب کی کسی کسوٹی پر پرکھا جا سکے۔ (۹)

نیز

> "حقی صاحب کے اداریے بڑے فکر انگیز اور مدبرانہ ہوتے تھے، ہر شمارہ میں ایک گھمبیر موضوع پر اداریہ بعنوان، افتتاحیہ یا اختتامیہ "شامل ہوتا موضوعات دیکھیے، رومن الفاظ کا معیاری ضابطہ، اردو کے مسائل اردو زبان کی تبدیلیوں کا معروضی جائزہ۔۔۔پاک بھارت جنگ کا تجزیہ بحوالہ اردو، زبان اور تعلیم زبان چند مسائل، اردو میں علاقائی الفاظ کی شمولیت کا مسئلہ، زبان ایک سیاسی مسئلہ، لُغویات یا لَغویات اور زبان وسیلہ آتشی۔یہ تنوع ہی حقی صاحب کی صحافت کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔(۱۰)

شان الحق حقی کے دیگر اخبارات ورسائل میں گاہے بہ گاہے لکھے گئے کالم / مضامین کا مقصد بھی فروغ و نفاذ اردو میں حائل علمی، تحقیقی، لسانی اور سماجی مشکلات و اعتراضات کو رفع کرنا تھا۔

تاریخی طریقہ کار:

محمد طارق غازی کے مضمون "زبانوں کی ماں" کے مطابق افریقی، ایشیائی اور ملیالم زبانیں حضرت ادریس کے مرتب کیے ہوئے سریانی زبان ابجد میں لکھی جاتی ہیں اس کے علاوہ قدیم روایتی منگولی، چین کی مانچو، قدیم سغدانی، قدیم ہنگروی، قدیم ارخانی ترکی، کرغیزستان کی قدیم اویغوریہ کا رسم الخط سریانی ابجد سے اخذ کیے گئے ہیں نیز فارسی، دری، پشتو کے علاوہ سندھی زبانیں بھی یہی سریانی / عربی" الفبا" استعمال کرتی ہیں۔ مختصراً

> اس لسانی پس منظر میں حضرت ادریسؑ کی مرتب کی ہوئی تہذیب اور ان کی لسانی اور دیگر بے شمار مادی ایجادات سارے عالم کی مادر تہذیب اور ان کی بنائی ہوئی ابجد تمام زبانوں کا اصل رسم الخط ثابت ہوتی ہے جس میں حسن کاری، اصول خطاطی، قلم پر گرفت کے انداز وغیرہ کی بنا پر مختلف زبانوں میں حروف کے اندر کچھ تبدیلیاں ہوتی گئیں جیسا کہ عربی / فارسی / اردو کے مختلف خطوط نستعلیق، نسخ، ریحانی، اور ثلث میں (د)، (ک)، (م) وغیرہ میں نظر آتے ہیں مگر اساسی طور پر ساری دنیا کی زبانوں کی ابجد آج بھی وہی ہے جو حضرت ادریسؑ نے بنادی تھی۔(۱۱)

مسلم شمیم "اردو کا مقدمہ" تاریخ کے ایوان عدل میں " اردو زبان کے نام کے بابت لکھتے ہیں کہ اس کا نام "ہندوستانی" ہے اور اس کو اردو کی بجائے اس کے اصل نام یعنی ہندوستانی سے موسوم کیا جائے تا کہ اس

کی غیر ارضیت، لامکانیت اور غریب الدیاری کا خاتمہ ہو سکے۔ اور اس بات کے دلیل کے لیے مضمون میں اردو کے ارتقاتک کے دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

پروفیسر غلام شبیر رانا "لسانی مطالعہ۔۔۔ایک جائزہ" کے عنوان سے پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب "لسانی مطالعے" کی خوب تعریف و توضیح کرتے ہیں کہ جہاں یہ تصنیف اپنے افکار تازہ کی بدولت ایک جہان تازہ میں پہنچا دیتی ہے وہیں یہ کتاب نئے تخلیق کاروں کو نئے آفاق تک رسائی میں بھی مدد گار ثابت ہو گی۔ تبصرہ نگار جہاں موضوعات سے مختصرا متعارف کراتے ہیں وہیں الگ سے بھی ہر باب سے متعارف کراتے ہیں۔ ان کے مطابق کتاب میں جو جو مباحث شامل ہیں

> ان میں زمانہ قدیم سے مروّج گرامر کی شرائط اور قواعد و ضوابط، معیاری زبان کی ترویج و اشاعت کی تمنا، مختلف بولیاں اور ان کے اثرات، تخلیقی گرامر اور اس کے مضمرات، آہنگ و تاثیر کی مظہر قواعدی صوتیات، اردو زبان میں مروّج و مقبول مختلف الفاظ کی بناوٹ، شکل وصورت، ترکیب اور ساخت، دائرۃ المعارف ولغات، گردانیں، معاصر زبانیں، آوازوں کی بازگشت، الفاظ کے مآخذ و استخراج، تاریخی صداقتیں اور تاریخ کا پیہم رواں دواں عمل، وقت کے سانحات کے زبان پر اثرات، اظہار و ابلاغ کی بے کراں وسعت، تخیل کی جولانی، جزیرہ جہلا کے مکینو کی کج روی کی آئینہ دار لرزہ خیز حشر سامانی، لسانیات سے وابستہ کثیر زمانی اور یک زمانی عوامل، اردو زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ کے امتزاج سے نمو پانے والی مخلوط زبان کا مزاج اور لسانیات میں راہ پا جانے والی اغلاط کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی دلی آرزو جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔ (۱۲)

عرفان شاہ اپنے مضمون "شان الحق حقی اور ترقی اردو بورڈ کی لغت" میں ترقی اردو بورڈ کے قیام کے عمل، اردو لغت کی تیاری کے ذیل میں شان الحق حقی کی خدمات اور اس سلسلے میں درپیش مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ نیز لغت نویسی کے ذیل میں حقی صاحب کا پیش کردہ خاکہ، رہنما اصول اور اصول تدوین کے ذیل میں طریقہ اندراج، ترتیب حروف تہجی اور املا کے لیے ترتیب دیئے گئے اصولوں کو بھی شامل مضمون کرتے ہیں۔

ب۔ ادبی مجلے "الاقرباء" میں تحقیق و تنقید پر مبنی آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ بلحاظ افکار و طریقہ کار:

ادب اطفال:

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا کے مضمون "ہر لحہ دل زار تجھے یاد کرے" کے مطابق بچوں کے ادب کے ذیل میں اسلم کولیسری نے "کھنڈر میں چراغ"، "زخمی گلاب"، "انوکھے شکاری" اور "چاند کے اس پار" لکھ کر داد پائی جب کہ مسعود احمد برکاتی نے بیس کتب تصانیف کیں۔ جن میں تراجم کے حوالے سے "پیاری سی ایک پہاڑی لڑکی"، "تین بندوقچی"، "مونٹی کرسٹو کا نواب" اور "ہزار خواہشیں" شامل ہیں نیز اردو کتب میں "ایک کھلا راز"، "جوہر قابل"، "چور پکڑو"، "دو مسافر دو ملک"، "صحت کی الف، ب"، "صحت کے ۹۹ نکتے"، "فرہنگ اصطلاحات"، "قیدی کا اغوا"، "مفید غذائیں" اور "وہ بھی کیا دن تھے" شامل تھے۔ مضمون میں پاکستان میں پس نو آبادیاتی دور میں بچوں کے مجلات کے حوالے سے "آنکھ مچولی"، "اتالیق"، "اچھا ساتھی"، "اطفال ادب"، "امید فردا"، "انوکھی کہانیاں"، "بھائی جان"، "بچوں کی دنیا"، "پکھیرو"، "تعلیم و تربیت"، "ٹافی"، "جنت کا پھول"، "چاند ستارے"، "چند زنگری"، "ساتھی"، "شاہین" اور "ڈائجسٹ" وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ نیز احمد بخش ناصر کی تحریک پر بچوں کے حوالے سے ادب تخلیق کرنے والے ان کے احباب کی ایک طویل فہرست بھی ملتی ہے۔

لوک داستانیں:

احمد بخش ناصر کے تحقیقی و تنقیدی خدمات کے ذیل میں ان کے حسن و عشق پر مبنی لوک داستانوں پر لکھے گئے تحقیقی و تنقیدی مضامین جو کہ مجموعہ "روداد و بے داد" میں موجود ہے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ نیز جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات، رد تشکیل اور مافوق اضافی حقیقت جیسے موضوعات پر لکھے گئے تحقیقی و تنقیدی مضامین میں جن مشرقی اور مغربی ناقدین سے استفادہ کیا گیا ہے کی تفصیل بھی ملتی ہے۔

نراجیت:

مسلم شمیم کے مضمون کے مطابق نراجیت اگرچہ سیاسی نظریہ ہے تاہم اس کی صدا معاشرتی زندگی اور اس کے طفیل ادب میں رونما ہوتی ہے۔ ادب میں نراجیت سے مراد ادب کو سماجی کردار سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ ادب میں نراجیت کے فروغ میں سماجی حالات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ مضمون میں ہندوستان کے نو آبادیاتی دور میں ہیئت اور اسلوب کے نئے نئے تجربوں کو نراجیت سے موسوم کیا گیا ہے۔ نظریاتی سطح پر

نراجیت کی تشکیل کے حوالے سے وجودیت کا ذکر ملتا ہے جو کہ جدیدیت کی اصطلاح سے موسوم ہے۔ نیز نراجیت کی ایک اور تشکیل ادب اور نظریے کے حوالے سے بھی نظر آتی ہے۔

غالب کی نثر:

خیر الدین اعظم "غالب جدید نثر کا پیش رو" کے عنوان سے غالب کی نثر کا جائزہ خطوط کے حوالے سے لیتے ہیں۔ مضمون کے مطابق غالب کی نثر میں نہ صرف انشا پردازی کے سارے نمونے یعنی توضیحی، بیانیہ، تاثراتی اور انانیتی نثر کے عمدہ نمونے ملتے ہیں بلکہ ڈرامائی اور افسانوی رنگ بھی نمایاں ہے اسی حوالے سے مثالیں بھی دی گئی ہیں۔

ادبی صحافت / خدمات:

شعیبہ معید اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "بہاول پور میں شائد ہونے والے اخبارات و جرائد کی ادبی خدمات" کے عنوان کے تحت موضوع کا تعارف اور جواز تحقیق کے بعد بہاول پور سے شائع ہونے والے اخبارات و جرائد کی فہرست فراہم کرتی ہیں۔

جاپان کی سویامانے کی جانب سے اردو رسالہ کلچر کے تاریخی ارتقا کے جائزے میں احمد ندیم قاسمی کی خدمات کا بھی جائزہ لیا گیا۔ اردو رسالہ کلچر کا یہ ارتقائی سفر بیسویں صدی کے آغاز میں "مخزن"، "پھول"، "تہذیب نسواں" سے شروع ہوا جس میں بعد ازاں "کارواں"، "امروز"، "اقبال"، "صحیفہ"، "ادب لطیف"، "سویرا"، "نقوش"، "نیا دور"، "اوراق" اور "فنون" کا اضافہ ہوتا گیا۔ جب کہ قاسمی کی خدمات کے ضمن میں "پھول"، "تہذیب نسواں"، "سویرا"، "نقوش"، "امروز" کا ذکر ملتا ہے اور خدیجہ مستور اور ہاجرہ مستور جیسی افسانہ نگار ان کی ادبی کاوشوں سے ہی سامنے آئیں۔

یاد رفتگاں میں ظہیر حسن ظہیر کا قلم حافظ محمود شیرانی کے تحقیق کے ضمن میں خیالات اور تحقیقی و تنقیدی خدمات کے حوالے سے ان کی کتاب "پنجاب میں اردو"، "فردوسی و شاہنامہ" اور "تنقید شعر العجم" کو موضوع بناتے ہیں۔ خیر الدین "انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اور مولوی عبد الحق کی ادبی خدمات" کے عنوان سے مولوی عبد الحق کی انجمن کی مالی معاونت کے لیے کاوشوں اور پھر ان کی سرپرستی میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست فراہم کرتے ہیں۔

تنقید کے اصول:

ڈاکٹر گل ناز بانو "ادب اور زندگی میں نقد و انتقاد کا ناگزیر عمل "کے عنوان سے تنقید کی تعریف،ضرورت، تنقید کے اصول کے ذیل میں جمالیاتی و تاثراتی دبستان،سائنٹفیک تنقید،مارکسی تنقید،نفسیاتی تنقید، تاریخی دبستان، تجرباتی تنقید اور بنیادی اصولوں کے ذیل میں بھی تیرہ اصول مزید بتاتی ہیں۔

تاریخی وسوانحی طریقہ کار:

"الاقرباء" کے مجلے میں عالمی ادب کے گوشے میں مغربی ادباء کے حیات وعلمی و ادبی خدمات پر مبنی مضامین شامل کیے جاتے ہیں ذیل میں ان تحاریک اور مغربی ادباء کے مخصوص نظریات و خدمات کا ذکر کیا جارہاہے:

تانیثیت:

سلینہ رسم علی کا مضمون بعنوان "انقلاب فرانس: تانیثیت کا محرک" کے مطابق انقلاب فرانس نے جہاں مزدوروں اور دستکاروں کے حقوق کی بات کی وہیں اس کی بدولت عورت کے روشن مستقبل کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ یہ مضمون اس ضمن میں کردار ادا کرنے والی شخصیات اور انجمنوں جیسے والٹیئر،روسو، مانٹسکو، میری وال اسٹون کرافٹ، Olympe de gouges,Mme De Condorcet,Socity of Revolutionary Republican,Women's union for the Defence of Paris, and Care of the Injured, Suffregates Movements,The monthly Journal Des demes. کی خدمات کا احاطہ کرتا ہے نیز پندرھویں، سترھویں اور اٹھارویں صدی میں عورت کے سماجی مقام اور اس سے متعلق نظریات کو بھی شامل کیا گیاہے۔

ساختیات:

ہر من نارتھروپ سے متعلق مضمون ان کی ولیم بلیک(William Black) کی شاعری کی تفہیم پر مبنی کتاب(Fearful Symmetry) کی وضاحت اور دوسری تصنیف(Anatomy of Critcsm) کے چار ابواب کے تعارف پر مبنی ہے نیز رومانیت کے حوالے سے کام اور دیگر تصنیفات کا ذکر بھی ملتاہے۔ مضمون کا بیشتر حصہ ساختیات سے متعلق نظریات پر مبنی ہے۔ تزویتاں تودروف پر مبنی مضمون میں ان کا ذکر ساختیاتی فکر کے علمبرداروں اور بنیاد گزاروں کے حوالے سے کیا گیاہے۔ مضمون میں ان کے بائیس تصانیف کا ذکر ملتا

ہے جب کہ تنقیدی نظریات کے ضمن میں بیانیہ اور کردار نگاری سے متعلق نظریات کی وضاحت کے بعد تزویتاں تودروف کے اسلوب کا جائزہ ان الفاظ میں لیا گیا ہے:

> اس نے اصناف ادب کی گرامر کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس نے قارئین ادب پر واضح کر دیا کہ دنیا کی ہر زبان میں تخلیق ادب کے لیے ادب کی گرامر سے آگہی ناگزیر ہے۔ اصناف ادب کے لیے گرامر کی احتیاج اس قدر لازم ہے جتنی کہ یہ بیانیہ کے لیے لازم ہے۔ [۱۳]

رومن جیکب سن کی بدولت ساختیات اور ساختیاتی لسانیات کی تھیوری کے ارتقا میں مدد ملی۔ مضمون کے مطابق اس نے لسانیات، علم گرامر اور آوازوں کے مطالعے پر خاص توجہ دی۔ "علم بیان سے وابستہ مختلف صورتیں جن میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل شامل ہیں وہ رومن جیکب سن کی دلچسپی کے مرکز ہیں۔" [۱۴] مضمون میں تصانیف کے ذکر کے بعد لسانیاتی تھیوری اور لسانیاتی ماڈل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ژیرار ژینت پر لکھے گئے مضمون کے ذیل میں تحقیقی و تنقیدی خدمات کے احوال میں بیانیہ سے متعلق نظریات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور بیانیہ کے سلسلے میں ان کے ڈسکورس کو وقت (Time)، دورانیہ، رفتار (Speed) فریکونسی، موڈ (Mood) اور تناؤ (Perspective) کے تحت موضوع کا حصہ بنایا گیا ہے۔ روسی دانشور ولادی میر پروپ کا ذکر بیانیہ کے ساختیاتی حوالے سے کیا گیا ہے۔ ولادی میر پروپ کے خیال میں لوک کہانی کے کرداروں کی بدولت بیانیہ کی تاب و تواں کا سارا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ لوک کہانیوں پر کام کے سلسلے میں انہوں نے ان کہانیوں میں سات مختلف قسم کے کرداروں کی نشاندہی کی ہے۔ لوک کہانیوں کے حوالے سے کیے گئے ان کے کام کو مضمون کا حصہ بنایا گیا ہے۔

ژاک لاکاں پر لکھے گئے مضمون کے مطابق ژاک لاکاں نے تحلیل نفسی کے بانی سگنڈ فرائڈ کے نظریے کو اپنی فکر کی اساس بنایا۔ ژاک لاکاں کے مطابق لاشعور کی تشکیل بھی بالکل زبان کی تشکیل کی مانند ہوئی ہے۔ مضمون کے مطابق:

> اس نے سگمنڈ فرائڈ کے تصور کو آگے بڑھا کر اسے حیاتیاتی عمل سے لسانیات کی اساس پر استوار کرنے کی سعی کی۔۔۔ پس ساختیات سے متعلق اس بیگانگی، موضوعیت، جنسی اختلافات محرکات، قانون اور تفریح جیسے موضوعات پر نہایت دلنشیں انداز میں اپنے خیالات پیش کیے۔ [۱۵]

جولیا کرسٹیوا پر لکھے گئے مضمون کے مطابق،جولیا کرسٹیوا نے پس ساختیات، تانیثیت اور تحلیل نفسی پر توجہ دی۔اس نے سگمنڈ فرائڈ کے تحلیل نفسی کے نظریہ اور سوسیئر اور چارلس سینڈرز پیئرس کے تصورات Semiotics کو اپنی فکر کی بنیاد بنایا۔یہ مضمون جولیا کرسٹیوا کے پس ساختیات سے متعلق تصورات کو زیر بحث لاتا ہے۔برطانیہ کی ممتاز ادیبہ ،نقاد اور ادبی تھیورسٹ کیتھرین بیلسی کی تحقیق و تنقید پس ساختیات سے متعلق مسائل و مضمرات کے گرد گھومتی ہے۔اس ضمن میں وہ پس ساختیاتی فکر کو ثقافت، تاریخ اور تنقید کے مختلف پہلوؤں سے دیکھتے ہوئے عملی زندگی میں تخلیق ادب سے منسلک کرتی ہیں۔ مضمون جہاں اس کی تصنیفات، یونانی فلسفیوں کے افکار پر تحقیق و تنقید اور کلاسیکی ادب کے ساتھ قدیم و جدید تنقید کے ذکر پر مبنی ہے وہیں اس کے پس ساختیاتی تھیوری سے متعلق کتاب "Critical Practice" اور "Desire Love Stories in Western Culture" کو بھی مضمون کا حصہ بنایا گیا ہے۔پیئر ماشیرے نے اگرچہ براعظمی تھیوری، مارکسزم اور پس ساختیات کے حوالے سے اہم کام کیا تاہم یہ مضمون پس ساختیات کے حوالے سے اس کی کتاب" A Theory Of Literary " تحقیقی مقالے" Hegal or Spinoza"،" Reading Capital " اور "In a Materialistic Way" کو زیر بحث لاتا ہے۔میخائل باختن نے ادبی تحقیق و تنقید، فلسفہ لسانیات، علم بشریات، ادبی تھیوری، علامتی ابلاغیات اور اخلاقیات کے شعبوں میں کام کیا ۔یہ مضمون ان کے انسانی سائیکی سے متعلق آرکیٹکٹونک ماڈل،، تصنیفات، روسی ہیئت پسندی اور مارکسزم سے متعلق مضامین کے ذکر پر مبنی ہونے کے ساتھ لسانیات سے متعلق نظریات کا احاطہ کرتا ہے۔ مضمون کے مطابق:

> سماجی اعتبار سے دیکھا جائے تو میخائل باختن انسانی جسم اور ذہن و ذکاوت کے باہم اثر انداز ہونے اور باہمی تفاعل پر یقین رکھتا تھا۔وہ معانی اور ڈسکورس کی بحث کو جس انداز سے آگے بڑھاتا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس کے خیالات پس ساختیات سے قریب تر ہیں۔اس نے تنقیدی تھیوری، تحلیل نفسی،وجودیت اور فکشن کے اہم موضوعات پر جو پیرائیہ اظہار اپنایا اس کا مطالعہ کرنے سے یہ تاثر پختہ تر ہو جاتا ہے کہ میخائل باختن نومارکسسٹوں کا ہم آواز ہے۔[۱۶]

روسی ہیئت پسندی:

"روسی ہیئت پسندی۔۔۔ایک مطالعہ " کے عنوان سے لکھا مضمون نگار روسی ہیئت پسندی کے ارتقا اور اس ضمن میں کردار ادا کرنے والے ادیبوں کی خدمات کا بھی جائزہ لیتا ہے نیز یہ مضمون ماسکو لینگوسٹک سرکل اور پراگ اسکول کے خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

مسلم شمیم کے مطابق انیسویں صدی میں پیدا ہونے والی تین شخصیات سگمنڈ فرائیڈ، چارلس ڈارون اور کارل مارکس نے انسانی معاشرے کو فکری اور سماجی انقلابات سے دور چار کیا ان کی فکر و دانش کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی اور ہم جہت نظر آتی ہیں کیوں کہ فرائیڈ سے قبل کے فلسفی انسانی شعور، ادراک اور جذبات و تحریکات کے بیان میں قیاسات اور الوہی مداخلتوں کو اہمیت دیتے تھے جب کہ فرائیڈ نے انسان کا مطالعہ معاشرتی کردار اور جنس کے حوالے سے کر کے اسے سائنس کی شکل دی۔ چارلس ڈکن کا دعوی کہ انسان کے جد امجد لنگور و بندر تھے سے مذہبی حلقے خاص طور پر متاثر ہوئے جو کہ کیتھولک چرچ کے اقتدار کے خاتمے کا آغاز ثابت ہوا اور کارل مارکس کے مارکسزم نے انسانی معاشرے کو صدیوں پرانی استحصال زدگی نجات دلائی۔ مختصرا

> سگمنڈ فرائیڈ کی "Studies in Histeria" اور "Interpretation of Dreams" چارلس ڈارون کی "Origin of the Species" اور کارل مارکس کے داس کیپٹل اور کمیونسٹ مینی فسٹو کے تناظر میں انسانی تہذیب و تمدن کے سفر ارتقا پر نگاہ ڈالی جائے تو غار سے خلا تک انسانی سفر کے ارتقا کے مراحل کو سمجھنے میں مدد دیں گے (۱۷)

مسلم شمیم "سقراط، افلاطون، ارسطو۔ تثلیث فکر و فلسفہ" کے عنوان سے سقراط، افلاطون اور ارسطو کی حیات و فلسفیانہ نظریات کو موضوع بناتا ہے۔ مضمون کے مطابق استاد اور شاگرد کے رشتے پر مبنی اس تثلیث نے فکر و فلسفے میں نہ صرف ایک دوسرے سے استفادہ کیا بلکہ اس میں اضافہ اور توسیع بھی کی۔ سقراط نے مابعد الطبیعات کے حوالے سے کائنات سے متعلق سوالات اٹھائے، ہوتے ہوتے خدا کے ایک ہونے کا تصور دیا۔ اس کے شاگرد افلاطون نے سیاست اور اخلاقیات کو موضوع بنایا اور اس کی لکھی ہوئی چھتیس کتابوں میں (Republic) کو زیادہ شہرت ملی جب کہ افلاطون کے شاگرد ارسطو کی وجہ شہرت شعر و ادب کی تنقید پر مبنی کتاب "بوطیقا" ہے اور سیاست کے حوالے سے "Politics" کو شہرت نصیب ہوئی۔

رومانیت:

"لان جائنس (Longinus) ایک مطالعہ "کے عنوان سے رومانی ناقد لان جائنس کے تنقیدی تصورات اور اسی حوالے سے اس کی تصنیف "On The Sublime" کو مضمون کا حصہ بنایا گیا ہے۔

نفسیات:

ڈاکٹر شمیم الدین ترمذی کے تبصرے کے مطابق ثاقبہ رحیم الدین کے ادبی مضامین پر مبنی مجموعہ "تہذیب کے زخم" کے ہر مضمون کا موضوع اگرچہ تہذیب ہے تاہم مجموعے کے ادب پاروں پر مصنفہ کی اپنی شخصیت کی چھاپ گہری دکھائی دیتی ہے۔وہ آپ بیتی کو جگ بیتی کے رنگ میں پیش کرتی ہیں۔

سوانحی آثار:

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کے تبصرے کے مطابق کرامت بخاری کی کتاب "تنقیدی نظریات" مولانا چراغ حسن حسرت، قراۃ العین حیدر، سجاد باقر رضوی،اشفاق احمد، سید ضمیر جعفری، منیر نیازی،احمد ندیم قاسمی، سیف الدین سیف، حسرت حسین حسرت،خاطر غزنوی، مشکور حسین یاد اور بشری رحمٰن وغیرہ کے احوال و آثار پر مبنی ہے۔

تحقیق:

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل کی کتاب "اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے" پر تبصرہ کے مطابق یہ کتاب جہاں پاکستان میں اردو تحقیق کی صورت حال اور درپیش مسائل کا ذکر کرتی ہے وہیں چند مفید تجاویز سے بھی بہرہ مند کرتی ہے۔کتاب کے چار ابواب کا تعارف کتاب کے بیش قیمتی ہونے کا پتہ دیتی ہے نیز کتاب کے اہم مضامین کا الگ سے بھی ذکر کیا گیا ہے۔

تقاریز:

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا کے تبصرے کے مطابق سید منصور عاقل کی کتاب "متاع فکر و نظر" نوے کتابوں کے تبصرے اور چھ تقاریز پر مشتمل ہے۔

تاریخ:

ڈاکٹر جاوید خورشید، لیلیان سکستین نازرو کی مترجمہ "تاریخ ادبیات اردو" پر تبصرہ کرتے ہیں جس کے مصنف گارساں دتاسی ہیں۔ مبصر کے مطابق نازرو اس تصنیف کو تاریخ نویسی کے طور پر دیکھتی ہیں۔اس میں ہندوستانی زبان کے آغاز و ارتقا دیوناگری رسم الخط پر بحث ملتی ہے ان کے مطابق:

یہ ایک قسم کی قاموس ہے جس میں مصنفین کے حالات درج کیے گئے ہیں۔۔۔ بہت سے مصنفین ایسے تھے جنہیں تاریخی نقطہ نظر سے ترتیب دینا مشکل تھا اس لیے ان کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے اس میں مسعود سعد سلیمان سے لے کر غالب کی وفات تک کے زمانے یعنی قریباً آٹھ صدیوں کا احاطہ کیا گیا ہے(۱۸)

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کے تبصرے کے مطابق کرامت بخاری کی کتاب "تنقیدی نظریات" مولانا چراغ حسن حسرت، قراۃ العین حیدر، سجاد باقر رضوی، اشفاق احمد، سید ضمیر جعفری، منیر نیازی، احمد ندیم قاسمی، سیف الدین سیف، حسرت حسین حسرت، خاطر غزنوی، مشکور حسین یاد اور بشری رحمٰن وغیرہ کے احوال و آثار پر مبنی ہے۔ مبصر سید منصور عاقل مصنف امین راحت چغتائی کی کتاب "مراحل (تنقید تحقیق اور مطالعہ)" کو ایک تاریخ ساز دستاویز قرار دیتے ہیں کیوں کہ چوبیس ابواب پر مبنی یہ تصنف یہ قومی اور بین الاقوامی شناخت رکھنے والی شخصیات پر مبنی ہے ان کے مطابق:

۔۔۔ یہ ایک ایسی تاریخ ساز دستاویز قرار دیے جانے کی مستحق ہے جو برصغیر پاک و ہند میں عہد بہ عہد عمرانی مسالک تہذیبی و ثقافتی امتزاجات اور سیاسی و نظریاتی عوامل نیز آہنگ و اسلوب پر مشتمل ایک مبسوط لیکن جامع منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ (۱۹)

حوالہ جات

۱. ذوالفقار علی دانش،ڈاکٹر، تصوف اور ادب کا باہمی تعلق (مضمون)، مطبوعہ: ادبیات، اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ۱۱۹، ۲۰۱۹ء، ص ۲۳۳۔

۲. نثار ترابی،ڈاکٹر، ندیم کا تنقیدی شعور (مضمون)، ایضاشمارہ۱۰۸، ۲۰۱۶ء، ص ۴۰۱۔

۳. اقبال آفاقی،ڈاکٹر، ہیگل کی جمالیات اور فلسفہ آرٹ (مضمون) ایضا،۱۰۵، ۲۰۱۵ء، ص ۱۵۱

۴. محمد حمید شاہد، تخلیقی عمل اور تازگی (مضمون)، ایضا، ص ۱۸۲

۵. صلاح الدین درویش،ڈاکٹر، مابعد جدیدیت، لبرل علوم اور ڈی کنسٹرکشن، (مضمون) ایضا، شمارہ۱۰۶، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۹۔

۶. ایضا، ص ۱۵۳۔۱۵۴

۷. سعادت سعید،ڈاکٹر، انتظار حسین کی ادبی تنقید اور علامتی زوال کی حکایت (مضمون)، ایضا، شمارہ ۱۱۱۔۱۱۲، ۲۰۱۷ء، ص ۲۷۴۔

۸. عقیل دانش، سب رس کی لسانی، تاریخی اور ادبی اہمیت، (مضمون) مطبوعہ الاقربا، شمارہ جولائی۔ستمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۴۱۔

۹. عرفان شاہ،ڈاکٹر، شان الحق حقی کی ادبی صحافت (مضمون)، مطبوعہ: الاقرباء، شمارہ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۲۔

۱۰. ایضا، ص ۱۰۲۔۱۰۳

۱۱. محمد طارق غازی، زبانوں کی ماں (مضمون) ایضا، شمارہ جنوری۔مارچ / اپریل۔جون ۲۰۱۵ء، ص ۳۳۲۔

۱۲. پروفیسر غلام شبیر رانا لسانی مطالعے۔۔۔ایک جائزہ (تبصرہ) ایضا، شمارہ جولائی۔ستمبر ۲۰۱۷ء، ص ۲۹۶۔

۱۳. پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا، تزویتاں تودروف (مضمون)، ایضا، شمارہ جولائی۔ستمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۸۰۔

۱۴. ایضا، ص ۱۸۷۔

۱۵. پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر راعنا، ژاک لاکاں، (مضمون)، ایضا، شمارہ جنوری۔مارچ / اپریل۔جون ۲۰۱۵، ص ۲۳۹۔

۱۶. پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا، میخائل باختن۔۔۔ایک مطالعہ (مضمون)، ایضا، شمارہ جنوری تا جون ۲۰۱۶ء ص ۲۳۴۔

۱۷. مسلم شمیم، فرائیڈ، ڈارون، مارکس اور انیسویں صدی کی دانش عناصر ثلاثہ (مضمون) ایضا، شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء ص ۲۰۳
۱۸. جاوید احمد خورشید، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات اردو (تبصرہ)، ایضا، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۵ء، ص ۲۳۵۔
سید منصور عاقل، اردو تحقیق۔ صورت حال اور تقاضے (تبصرہ)، ایضا، شمارہ جنوری تا جون ۲۰۱۸ء، ص ۳۵۵۔

باب چہارم:

ادبی مجلوں میں شعری مقالات / آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ

(۲۰۱۵ء تا ۲۰۲۰ء)

الف۔ نظم پر مبنی آرٹیکل افکار و طریقہ کار کے لحاظ سے

ادبیات میں شعری مقالات / آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ بلحاظ افکار و طریقہ کار

نظم:

۲۰۱۵ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک ادبی مجلے ادبیات کے نظم پر مبنی آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ افکار اور طریقہ کار کے حوالے سے کیا گیا۔ اس مطالعے کے دوران درج ذیل افکار اور طریقہ کار کا مشاہدہ ہوا۔

مذہبی شاعری:

احمد ندیم قاسمی کے یہاں اقبال کی روایت کے تسلسل کے بہت سے اشارے ملتے ہیں جیسے کہ اقبال کے وحدت الوجود کے نفسیاتی اور احساساتی جہتیں قاسمی کے یہاں بھی ملتے ہیں مثلاً اسی حوالے سے ذیل میں اقبال کا شعر دیکھا جاسکتا ہے:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری   لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

جب کہ ندیم کی رباعی دیکھیے:

عکس اس کا بہر رنگ نظر آتا ہے   ہر شے پر طلسم بن کے منڈلاتا ہے

اے نرم ہواؤ، کلیو، غنچو   یہ کون جھلک دکھلا کے چھپ جاتا ہے [۱]

نیز تصور خودی، خدا سے شکوہ شکایت اور شوخی کے حوالے سے بھی احمد ندیم قاسمی کے کلام میں اشارے موجود ہیں۔ جب کہ قاسمی کی شاعری میں خدا کی شکر گزاری کی صورت بھی ملتی ہے۔ شازیہ اکبر کے مضمون کے مطابق قاسمی کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جس میں مقام انسان اور معرفت الٰہی کے ادراک کی واضح جھلکیاں ملتی ہیں۔ شازیہ اکبر، قاسمی کے یہاں اقبال کے اسلوب کے پیروی کے ساتھ شاہ ولی اللہ کے نظریات کی موجودگی کا بھی ذکر کرتی ہیں۔

جلیل حالی اور خاور نقوی احمد ندیم قاسمی کے نعتیہ شاعری کو موضوع بناتے ہیں کہ ندیم نے نہ صرف حضور ﷺ کی عقیدت و محبت میں باقاعدہ نعتیں لکھی ہیں بلکہ ان کی نظموں اور غزلوں میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں۔ جن میں حضورؐ کی سیرت اور تعلیمات کو اجاگر کیا گیا ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض اشعار کی بنیاد کسی نہ کسی حدیث یا قرآنی تعلیمات پر بھی مبنی ہے نیز قاسمی کے یہاں بعض ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں عصری بحرانوں میں آپؐ کو یاد کیا جاتا ہے جیسے کہ

ایک بار اور بھی بطحا سے فلسطین آ　　　راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصیٰ تیرا[۲]

حب الوطنی / ملی شاعری:

الطاف حسین حالی کے نظم نگاری کے ذیل میں زیادہ تر "مسدس حالی" کا ذکر ملتا ہے جسے ملی شاعری کا نقطہ آغاز کہا گیا۔ الطاف حسین حالی کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی وجہ تہذیبی شکست تھی۔ اس لیے تہذیبی عروج سے اس زوال کو روکا جا سکتا ہے جو کہ عروج اسلام اور سیرت نبویؐ کی بدولت ممکن ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس قومی دستاویز کے تصنیف میں حالی کا قلم تعصب اور نفرت سے آزاد رہتا ہے افسوس کہ "مسدس حالی" کی اس نصیحت پر عمل درآمد نہ ہو سکا اور نتیجے میں ان افعال و اعمال قبیحہ کا اثر پورے معاشرے میں پھیل چکا ہے۔ یوں اس مسدس کی جتنی ضرورت آج ہے اتنی شاید پہلے بھی نہ تھی۔

احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا ایک اہم موضوع حب الوطنی یعنی پاکستانیت ہے بلکہ ندیم کی شاعری میں پاکستانیت بولتی ہے۔ اس ذیل میں احمد ندیم قاسمی کے نظموں "جشن چراغاں"، "دعا"، "چھ ستمبر"، "میں روتا ہوں"، "اگر ہے جذبہ تعمیر زندہ"، "۲۵ الفاظ"، "کشمیر" اور "بھیک" کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

انسان:

اردو نظم میں جن چند شعراء نے انسان کو موضوع بنایا ہے ان میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نظمیں انسانی عظمت، انسان دوستی، نیز انسان کے کرب اور اسے درپیش آلائم کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نظمیں "انسان عظیم ہے خدایا"، "افلاک زمینی"، "ادب و سیاست"، "میں تمہارا ہوں"، "پتھر"، "پابندی"، "آشوب" اور "عشق کرنے کا کہاں وقت ہے انساں!" انسان سے متعلق انہی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔

سیاست:

احمد ندیم قاسمی کے یہاں ایشیا و افریقہ کے ممالک پر مغرب کی تھوپی ہوئی غلامی کو آزادی میں بدلنے کی خواہش اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ ملتی ہے۔اس موضوع پر ان کی نظموں میں "سیاسی مورچے میں"، "سپاہی کی واپسی"، "نیا ایشیا"، "مشرق و مغرب"، "تحریک آزادی الجزائر کے حوالے سے نظم "جمیلہ" فلسطین کے حوالے سے "چاند گہنا گیا"، کشمیر کے حوالے سے "کشمیر" ویت نام کے حوالے سے "ویت نام کا دعوت نامہ" پر بحث ملتی ہے۔الجزائر کے تحریک آزادی کے حوالے سے کردار ادا کرنے والے مجلات میں "ہم قلم"، "لیل و نہار" اور "امروز" اور اسی حوالے سے جمیل الدین عالی کے دوہوں کا ذکر ملتا ہے۔افریشیائی بیداری کے حوالے سے ظہیر کشمیری کے نظموں "ایشیا" اور "عظمت آدم" کا ذکر بھی ملتا ہے۔

تانیثیت:

الطاف حسین حالی پر مبنی مضامین میں ان کا ذکر طبقہ نسواں کے علمبردار کے حوالے سے ملتا ہے کیوں کہ انہوں سر سید دور میں نسائی معاملات پر معاشرتی اور اصلاحی انداز میں توجہ دی اس ذیل میں ان کی نظموں "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ترقی پسند:

ڈاکٹر صلاح الدین درویش، احمد ندیم قاسمی کی ترقی پسندی کو نمائشی روشن خیالی قرار دیتے ہیں کیوں کہ ان کی ترقی پسندی قومی، نسلی، ثقافتی، مذہبی، اور سماجی اقدار و روایات کی رد تشکیل کی بجائے دفاع کا منظر پیش کرتی ہے۔وہ انہی حوالوں سے قاسمی کی نظموں "غیرت اور ضمیر"، "ترقی یافتہ"، "ادب اور سیاست"، "درانتی"، "جبر اختیار"، "ایشیا"، "گناہ بے گناہی" اور "کمال دانش" کو زیر بحث لاتے ہیں۔ڈاکٹر روش ندیم کے مضمون کے مطابق قاسمی کی نظموں کے لیے تشکیل دی گئی زبان ترقی پسندی کی ایک جہت ہے۔وہ کمیونسٹ کی بجائے مسلم ترقی پسند شاعر ہیں جس کا اظہار ان کی شاعری میں مذہبی عناصر کی موجودگی سے ہو جاتا ہے جسے وہ اسلامی علامتوں، استعاروں اور فکری و ادبی عناصر کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔

ب۔ غزل پر مبنی آرٹیکل افکار، طریقہ کار کے لحاظ سے

۲۰۱۵ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک ادبی مجلے ادبیات کے غزل پر مبنی آرٹیکلز کا تجزیاتی مطالعہ افکار اور طریقہ کار کے حوالے سے کیا گیا۔اس مطالعے کے دوران درج ذیل افکار اور طریقہ کار کا مشاہدہ ہوا۔

سماج/معاشرت:

احمد ندیم قاسمی کی غزل میں معاشرتی رویوں جیسے جھوٹ، منافقت، فریب وغیرہ کے خلاف شکایت ملتی ہے نیز ان کے یہاں سیاسی اشارے بھی بڑے واضح ملتے ہیں۔ قاسمی تحریر و تقریر کے آزادی کے قائل تھے اور وہ ایسے کسی پابندی کو قبول نہیں کرتے۔ اس لیے مارشل لاء کے دور کے جبر واستبداد کی فضا کا عکس ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

عظمت انسان:

عظمت انسان کا موضوع قاسمی کی نظموں کے ساتھ غزل میں بھی ملتا ہے۔ وہ غزل میں بھی انسانی عظمت کے گن گاتے ہیں۔ دراصل ان کی شخصیت پر ان کے بچپن کے دیندار اور سادہ ماحول کا بڑا اثر تھا جس نے ان کی ذات میں انسانی عظمت کی پہچان، کائنات کے گہرے مشاہدے اور خدا کی قربت کے حصول کے رویوں کو جنم دیا۔ جیسے کہ درج ذیل شعر ہے:

اس حوالے سے کہ شہپارہ تخلیق ہے وہ　　　مجھ کو انسان سے خوشبوئے خدا آتی ہے (۳)

حسن و عشق"

حسن و عشق کا موضوع جہاں ہر شاعر کے یہاں ملتا ہے وہیں قاسمی بھی اس سے مبرا نہیں۔ قاسمی کے یہاں بھی عشق کی ابتدا گوشت پوست کے انسان "لڑکی" سے ہوتی ہے۔ تاہم یہ سلسلہ پر اپنی طرف اور پھر اپنی طرف سے حسن ازل سے مل کر مابعد الطبیعات کی سرحد سے مل جاتا ہے۔

جدید شاعری

الطاف حسین حالی عام طور پر اپنی غزلیہ شاعری کو قدیم اور جدید میں تقسیم کرتے ہیں۔ قدیم شاعری جو کہ روایتی موضوعات پر مبنی ہے لیکن جدید شاعری میں حسن عشق کے موضوعات کے ساتھ مسائل حیات کے اظہار کے لیے ایسے مضامین و لفظیات کو بھی شامل کرتے ہیں جن سے عام طور پر گریز کیا جاتا ہے نیز ان کی غزلوں میں افادیت و مقصدیت کے پیش نظر روایتی تغزل کا کوئی رنگ نہیں ملتا۔

الف۔ الاقرباء میں نظم پر مبنی آرٹیکل بلحاظ افکار و طریقہ کار:

مذہب:

پروفیسر سہیل اختر کے مطابق سید تابش الوری کی کتاب "سرکار دو عالم ﷺ" غیر منقوط نعت کے مجموعے پر مبنی ہے۔ مشکل ترین صفت یعنی غیر منقوط حروف کے اہتمام کے ساتھ سادگی بیان، سلاست اور عقیدت و احترام کے جذبوں کا والہانہ پن ان کے درج ذیل اشعار سے مترشح ہے:

سکوں مل رہا ہے اماں مل رہی ہے ۔۔۔ کرو ورد سارے محمدؐ محمدؐ

محمدؐ مصلح اولاد آدم محمدؐ سرور سردار عالم ۔۔۔ اسی کا ورد ہے ورد الٰہی اسی کا اسم ہے اسم ہے اسم مکرمؐ

رسولؐ کا ہوں موالی، مدد کو کس سے کہوں ۔۔۔ رسولؐ کا ہوں سوالی، سوال کس سے کروں (۴)

کرامت بخاری "بطور ثناء خوان محمدؐ وآل محمدؐ" کے عنوان سے حسرت موہانی کے نعت، منقبت، سلام، حمدیہ قطعات کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح شاکر کنڈان بھی علی نواز ناز کے احوال و آثار میں سلام، مرثیہ اور قصیدے کا ذکر کرتے ہیں۔ نجم الحسن بدایونی کے یہاں نعتیہ کلام نیز اثنائے عشری عقیدے کے اثرات ملتے ہیں۔ سید انتخاب علی کمال صنعت عاتلہ یعنی غیر منقوط صنعت کے استعمال کے حوالے سے نعت اور سلام کے ذیل میں مولوی رفیع احمد صبا متھراوی کا کلام پیش کرتے ہیں جب کہ اسی حوالے سے اصغر حسین راغب مراد آباد کے نعتیہ مجموعے "مدح رسولؐ" کا ذکر کرتے ہیں۔ ذیل میں اصغر حسین راغب مراد آبادی کے غیر منقوط نعتیہ کلام کا نمونہ درج ہے:

اسم سرکارؐ، مصدر اکرام ۔۔۔ اور ورد اس کا سرا وہام

وہ ہمارا رسولؐ، امام ہمام ۔۔۔ اللہ اللہ موسس اسلام (۵)

مضمون میں طاہر مجد د سلطانی کے کتاب "حمد الہ و مدح رسولؐ" کے تین غیر منقوط نعتوں کا ذکر اور نمونے موجود ہیں۔ سید امین علی شاہ نقوی کے حوالے سے غیر منقوط عربی نعتوں کے مجموعے "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اور "ردا الوردہ" اردو نعتیہ دیوان میں "محمد صلی اللہ علیہ وسلم محمدؐ" اور ایک نعتیہ مجموعہ "بلا الف حسن محمد" کا ذکر ملتا ہے۔ نیز ڈاکٹر ظفر ہاشمی قادری الوارثی کے ننانوے غیر منقوط نعتوں پر مشتمل مجموعے "نعت الحاج" جناب شاعر لکھنوی کے "روح الہام" طاہر سلطانی کی کتاب "حمد الہ و مدح رسولؐ" کے ایک حمد اور چار نعتوں کا ذکر ملتا ہے۔ سکینہ رملی بہادر ماریشس کے نعت گو شعراء کے عنوان سے حضرت علامہ ابراہیم خوشتر صدیقی، مرحوم طاہر دومن، قاسم علی محمد، صابر گودر اور سعید میاں جان کے نعتیہ شاعری کا

جائزہ لیتی ہیں۔انیس الرحمٰن، ضمیر جعفری کے نعتیہ اور حمدیہ شاعری کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی کے یہاں بھی قدم قدم پر سیرت نگاری کے حسین مرقعے نظر آتے ہیں نیز حسرت حاضری اور حضوری کی کیفیات جابجا نظر آتی ہیں۔ ولی عالم شاہین،مامون ایمن کی کتاب "صبا اکبر آبادی ایک ہمہ جہت شاعر" میں صبا اکبر آبادی کے نعتیہ شاعری، مرثیہ نگاری اور مذہبی رباعیات کا ذکر کرتے ہیں۔

حضورؐ سے عشق اقبال کے رگ وجاں میں بچپن کے ماحول اور تربیت کے زیر اثر رچ بس گیا تھا جس میں اضافہ مغرب میں تحصیل علم کے دوران ہوا۔کلام اقبال میں عشق رسولؐ کے مظاہرے "مسجد قرطبہ" ،"کلیمی"،"جاوید نامہ"،"فقر"،"حضور رسالت مآبؐ "اور"اسرار خودی"وغیرہ میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔علامہ اقبال کے یہاں اہل بیت میں حضرت علی،امام حسین،حضرت فاطمہ نیز خاندان رسالت کے آخری امام سے بھی عقیدت ومحبت کا اظہار ملتا ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی اور شبیہ کاری کا اہم ترین ماخذ قراں وسنت ہے۔ قرآن وسنت سے ماخوذ چند علامتوں میں تعمیر حرم، آتش نمرود، ضرب کلیم،ید بیضا،طور سینا،نغمہ جبرئیل،شاخ خلیل،صور اسرافیل،اسی طرح موسیٰ وفرعون،شبیر ویزید،ابوجہل،ابولہب،ابوتراب،صدیق اور فاروق مختلف اوصاف کی علامتیں ہیں نیز بشیر،نذیر،خلافت،شہادت،ذکر اللہ،لاتحف،لاتحزن اور قم باذن اللہ وغیرہ سے بھی قرآنی اسلوب نمایاں ہے۔بیدل کے فارسی شاعری کے اردو ترجمے "بہار ایجادی بیدل" کے حوالے سے بیدل کی شاعری کو زیر بحث لایا گیا ہے جس کے مطابق بیدل کی شاعری زیادہ تر عشق الہی اور حب رسولؐ پر مبنی ہے۔غالب نے جہاں رنگ سخن اور مفاہیم کے لحاظ سے بیدل کا تتبع کیا ہے وہیں اقبال بھی بیدل کے فلسفہ حیات اور معرفت کے قائل تھے جس کے اثرات ان کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔علامہ اقبال کے مولانا جلال الدین رومیؒ سے متاثر ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں قرآن نیز اسلام کی تشریح کی ہے۔اقبال اپنی شاعری میں امت کے لیڈر کا جو خاکہ پیش کرتے ہیں وہ خاکہ دراصل مولانا جلال الدین رومی کا ہی ہے۔ نظم "جاوید نامہ" کا پلاٹ معراج نبویؐ پر مبنی ہے اور جاوید نامہ میں ملت اسلامیہ کی خودی کے معراج کا پیش کردہ خاکہ لیڈر، رہبر یا مشیر، مثبت کردار اور منفی کردار پر مبنی ہے۔پروفیسر نغمہ زیدی کے "اقبال ایک موحد" کے مطابق علامہ اقبال نہایت دلنشین انداز میں عقیدہ توحید کی حقیقت فلسفیانہ انداز میں بتاتے ہیں کہ وجود عدم سے پیدا ہوتا ہے مثلا جو دانہ زمین میں بویا جاتا ہے جب وہ فنا ہو جاتا ہے تو اس میں روئیدگی اور نشو نما کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور یہی حال توحید کا ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز کی نفی کر دی جاتی ہے

تو اس سے خدا کے وجود، خدا کی عظمت، اور خدا کی وحدانیت کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے اور مسلمانوں کے قوت و جبروت کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ عقیدہ توحید کی یہ فلفیانہ وضاحت اقبال کے عربی اور فارسی کلام میں ملتی ہے۔ اسلام میں عقیدہ توحید کے اقرار سے رنگ نسل، خطہ، وطن، رسم ورواج جیسے امتیازات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان امت مسلمہ کا فرد بن کر سراپا رحمت و شفقت بن کر ایک محبت آمیز معاشرے کا حصہ بن جاتا ہے جب کہ آج مسلم ملت فرقہ پرستی میں مبتلا ہو کر باہمی عداوت کا شکار ہو گئی ہے۔ اقبال کے اردو اور فارسی شاعری میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جس میں فرقہ پرستی کی مذمت ملتی ہے ان کے مطابق قوم کو ملاؤں نے سنی، شیعہ، وہابی اور اہل حدیث وغیرہ میں تقسیم کیا ہے نیز انہوں نے عربوں کی وطنیت اور علیحدگی پسند تحریکوں کے خلاف بھی لکھا ہے۔ ایک وقت تھا کہ کلام اقبال کے معجزے سے ایک سوئی ہوئی قوم خواب غفلت سے جاگی اور الگ ملک کا حصول ممکن ہو سکا آج پھر معاشرے پر زوال چھایا ہوا ہے ارد گرد کوئی بھی صاحب کردار، صاحب اخلاق نظر نہیں آتا۔ چپڑاسی سے لے کر اعلی ترین منصب پر فائز کوئی بھی اس روگ سے نہیں بچا جب کہ اسی مرض سے چھٹکارے میں ہی قوم کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔ اقبال کی شاعری میں یہی پیغام مرد مومن کے تصور، شاہین کے استعارے، خودی کے پیام اور فقر و غنا کی تعلیم میں ملتا ہے۔ اقبال افغان قوم کو بھی خودی کی تلقین اور ایک قوم بننے اور قبیلہ پرستی چھوڑنے کی تلقین "محراب گل افغان کے افکار"، "خطاب بہ بادشاہ اسلام اعلی حضرت ظاہر شاہ"، "خطاب بہ اقوام سرحد" اور مثنوی "مسافر" میں کرتے ہیں۔ اقبال حیات جاوداں کے لیے سعی پر یقین اور توحید پر ایماں کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے تصور یقیں میں قادر مطلق کی طرف سے ودیعت کی گئی خودی کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ نیز کلام اقبال میں حریت فکر اور قوت عشق کی برتری پر یقین کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ مختصرا اقبال کا پیش کردہ مرد مومن کا تصور اخلاقیات اور روحانیت کے بلند منصب پر فائز ہے جو کہ خالق کی معرفت حاصل کر کے ہزار سجدوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ پروفیسر انوار احمد زئی "تلاش اقبال" میں اقبال کے افکار کا ماخذ اسلام کو ٹھہرانے کے بعد ڈاکٹر غلام مصطفی خان رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف "اقبال اور قراں" کا ذکر کرتے ہیں جس میں ڈاکٹر صاحب نے "اسرار خودی"، "رموز بے خودی"، "پیام مشرق"، "زبور عجم"، "جاوید نامہ"، "بال جبریل"، "پس چہ بائد کرد اے اقوام مشرق"، "مسافر"، "ضرب کلیم"، "ارمغان حجاز"، "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں ایسے اشعار کی نشاندہی کی ہے جس کا منبع و سرچشمہ قرآنی تعلیمات ہیں جب کہ کتاب "اقبال اور حدیث" کے عنوان سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے شاگرد ڈاکٹر محمد عبد المقیت شاکر علیمی نے "بانگ درا"، "بال

جبریل"،"ضرب کلیم" اور "ارمغان حجاز" میں ان اشعار کی نشاندہی کی ہے جس کی بنیاد حدیث پر رکھی گئی ہے۔

مابعد الطبیعات:

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی اقبال کے تصور زماں پر مسلم مفکرین (مسلم صوفی عین القضا ہمدانی) کے اثرات، جبر کے بجائے اختیار کے رویے کی تشکیل، جدید سائنسی تحقیقات کے تناظر میں اقبال کے تصور زماں کا تجربہ، اقبال کے تصور زماں کی تہذیبی اہمیت کے تحت بحث کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے فارسی اور اردو شاعری سے نمونے بھی پیش کرتے ہیں۔ اقبال، برگساں اور کانٹ کے نزدیک حقیقت تک رسائی عقل کے بل بوتے پر ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے وجدان بھی ضروری ہے۔ برگساں کے مطابق میرے احساسات، تاثرات، ارادات اور خیالات مسلسل مجھے مصروف رکھتے ہیں اور میں لگاتار بدلتا رہتا ہوں یوں میری داخلی زندگی میں جو کچھ ہے وہ ساکن کی بجائے مسلسل حرکت میں ہے اسی طرح تغیر اور انقلاب کائنات کی بنیادی حقیقت ہے جب کہ اقبال کے نزدیک زمانہ خود خدا ہے۔ انفرادیت کے حوالے سے بھی اقبال اور برگساں کے خیالات میں یکسانیت ملتی ہے۔ اقبال اللہ تعالی کے بے مثل و مطلق انفرادیت کے قائل ہیں جب کہ برگساں کے مطابق:

> انفرادیت کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ عالم حیات میں جہاں پر کہیں استحکام فردیت کا رجحان پایا جاتا ہے وہاں اسے توالد و تناسل کے مخالف رجحان کا بھی ہمیشہ سامنا رہا ہے، فرد کا کمال یہ ہے کہ اس کا کوئی حصہ اس سے الگ ہو کر علیحدہ طور سے نہ جی سکے لیکن ایسی صورت میں افزائش نسل ناممکن ہو جائے گی۔ اس لیے تناسل اس کے سوا اور کیا ہے۔ جسم کا کوئی حصہ اس سے الگ ہو کر ایک نئے جسم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لہذا انفرادیت خود اپنا دشمن اپنے گھر میں پالتی ہے۔[٦]

یوں اس تعریف کی رو سے فرد مطلق توالد کے عیب سے پاک ہو گا جو کہ اللہ تعالی کی ذات ہے اور سورہ اخلاص اس کی دلیل ہے۔ مضمون میں موضوع سے مطابقت رکھنے والے اشعار "بال جبرئیل" اور "جاوید نامہ" سے شامل کیے گئے ہیں۔

محمد فیصل، مرزا نظام شاہ لبیبؔ کے علامتی نظم "الو" کا ذکر تصوف کے حوالے سے کرتے ہیں اور اس سلسلے میں سید عبد اللہ کے اس رائے سے استفادہ کرتے ہیں کہ

> لبیبؔ کے اشعار میں مجھے وہی دو عناصر نمایاں معلوم ہوتے ہیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یعنی صوفیانہ داخلیت اور زبان کی تہذیب۔۔۔ لبیب کی داخلیت میں خارجی شکست خوردگی کے اندر سے نکلی ہوئی ایک انفعالی انانیت پائی جاتی ہے جس میں ان کی صوفیانہ زندگی اور مشاغل نے بڑا حصہ لیا"(۷)

پروفیسر شفیق الرحمٰن آلہ آبادی کے مضمون کے مطابق قابل گلاٹھوی کی غزل کا مرکزی موضوع سچائی، حقیقت اور عرفان حیات ہے۔ ان کے نظریہ معرفت کے مطابق انسان کبھی تو اپنی ذات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے تو کبھی اللہ کی ذات پر غور و فکر کے نتیجے میں اپنی حقیقت کو پا لیتا ہے اور حقیقت کو پا لینا ہی اصل میں عرفان ہے۔

وطنیت / ملت:

جمیل الدین عالی کے ذیل میں ان کے ملی نغموں اور دوہوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے ملی نغموں اور دوہوں میں وطن اور اہل وطن کے ساتھ قلبی وابستگی اور والہانہ محبت کا ظہار ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے لکھے ہوئے نغموں کا اعزازیہ کبھی نہیں لیا۔ ان کے مقبول زمانہ ملی نغے ۱۔ہم مصطفویؐ مصطفویؐ مصطفویؐ ہیں ۲۔ اے وطن کے سجیلے جوانو۔ ۳۔ میرا انعام پاکستان ۴۔ جو نام وہی پیغام پاکستان ۵۔ اتنے بڑے جیون ساگر میں تو نے پاکستان دیا۔۔ وغیرہ شامل ہیں۔

علامہ محمد اقبال کو ملت کی زبوں حالی مصروف گریہ رکھتی تھی جس کے لیے وہ کبھی اللہ کے حضور رجوع کرتے تھے تو کبھی ضمیر ملت سے مخاطب ہوتے تھے۔ ان کا یہ انداز تکلم ان کے نظموں "ایک آرزو"، "دعا"، "یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے"، "طارق کی دعا"، "تنہائی"، "طلبا علی گڑھ کالج کے نام"، "مسلم"، "یرموک"، "پھول اور شہزادی" اور "کفر و اسلام" میں ملتا ہے۔

تصور ارتقا:

مسلم شیم اور بیرسٹر سلیم قریشی اقبال کے تصور ارتقا پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جس میں مسلم نشاط ثانیہ کا نقطہ آغاز غالب کی فکر کو ٹھہرایا گیا۔ غالب نے سرسید کے "آئین اکبری" کی تقریظ میں مغرب میں رونما ہونے

والے تغیرات و ایجادات کا ذکر کرکے سر سید کے انداز کہن کی سرزنش کی جس پر سر سید غالب کی نصیحت پر عمل پیرا ہو گئے۔ اقبال کو اس تحریک کا نقطہ عروج ٹھہرایا گیا ہے جس نے اس سلسلے میں کائنات کے حرکی اور ارتقائی تصور پر زور دیا۔ اقبال کا ارتقائی تصور کے متعلق خیالات ان کی نظموں "ساقی نامہ"، "زمانہ"، "ارتقا" اور "والدہ مرحومہ کی یاد میں" ملتے ہیں۔ بیرسٹر سلیم قریشی کے مطابق اقبال کے اس تصور پر ان کے خطبے "The Reconstruction of Religious Thought in Iaslam" میں تفصیلی بحث ملتی ہے نیز اقبال تاریخ، تقدیر اور اجتہاد میں بھی ارتقائی تصور کی بات کرتے ہیں۔

معاشرت:

امین راحت چغتائی نے جاپانی ہائیکو اور سینیر یو نظموں کو فارسی و اردو کے نظم و غزل کے موضوعات کے پس منظر میں کار فرما تہذیبی اور معاشرتی اقدار و روایات نیز پاکستان کے معاشرتی احوال سے مزین کیا ہے۔ نیز امین راحت چغتائی کے یہاں غالب و اقبال، سعدی و غزالی، طالب آملی و بیدل کے علاوہ انگریزی شعر و ادب میں وڈزورتھ کی فطرت نگاری کی پر چھائیاں بھی ملتی ہیں۔ الطاف حسین حالی کا "مسدس حالی" ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندوستان کے مسلم معاشرے کے بھیانک زوال پذیری کے موضوع پر مبنی ہے۔ جس کے اثرات انیسویں صدی کے عمومی مسلم معاشرے پر خاطر خواہ پڑے۔ لیکن آج اکیسویں صدی میں مسلم دنیا ۵۷ ممالک پر مشتمل ہونے کے باوجود بھی بحران یعنی عسکریت پسندی، راسخ العقیدگی اور مذہبی انتہا پسندی سے دوچار ہے جس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ جس کی بدولت انسانیت دوست مذہب کو انسانیت دشمن لبادہ پہنا کر گہنا دیا گیا۔ اگر ان حالات میں حالی مسدس لکھتے تو یہ پہلے والے سے بھی زیادہ الم ناک ہوتا۔ عارف محمود کسانہ کے مضمون کے مطابق اقبال نے اپنے افکار کی بنیاد قراں پر رکھی ہے اور اقبال عمل کا پیغام دیتے ہیں نیز وہ آج کی نسل کو انتہا پسندی، عدم برداشت اور بے راہ روی سے بچانے کے لیے فکر اقبال سے روشناس کرانے کی سفارش کرتے ہیں۔ ادا جعفری کے عصری آگہی کے حوالے سے ان کی نظم "مسجد اقصی" کا ذکر کیا گیا ہے جس میں صیہونی مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے۔ کرامت بخاری کی نظمیں عصری تقاضوں اور رویوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں جیسے کہ درج ذیل نظم

اگر تم بیچنا چاہو۔۔۔ ادائیں بھی وفائیں بھی۔۔۔ حسین خوابوں کے رنگین ردائیں بھی یہ
دنیا ہے۔۔۔ یہاں آواز بکتی ہے۔۔۔ یہاں تصویر بکتی ہے۔۔۔ یہاں پر حرف کی حرمت
یہاں تحریر بکتی ہے۔۔۔ یہ بازار جہاں ایک بے کراں گہرا سمندر ہے۔۔۔ یہاں پر

کشتیاں ساحل پہ آ کے ڈوب جاتی ہیں۔۔۔مسافر مر بھی جاتے ہیں۔۔۔مگر رونق نہیں جاتی۔۔۔یہ انسانوں کا جنگل ہے اور اس جنگل میں منگل کا سماں ہر وقت رہتا ہے۔۔۔اگر تم بیچنا چاہو۔۔۔ادائیں بھی وفائیں بھی حسیں خوابوں کے رنگین ردائیں بھی۔۔۔مرے دل بھی اک بازار سجتا ہے۔۔۔جہاں پر شام ہوتے ہی ہجوم یاس ہوتا ہے۔۔۔غموں کی بھیڑ لگتی ہے۔۔۔کئی یوسف سر بازار بکتے ہیں۔۔۔اگر تم بیچنا چاہو۔۔۔![۸]

دوسرے عالمی جنگ کے بعد کے عہد کی عکاسی شاعر ابلاغ صہبا اختر کی شاعری میں ملتی ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی، اقتصادی، اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی شعبہ ہائے زندگی میں رونما ہونے والی مثبت اور منفی اثرات کا شعور و ادراک ان کے مجموعے "سرکشیدہ" اور "سمندر" میں نمایاں ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا "آخری عہد مغلیہ کی اردو شاعری" میں جہاں مغلیہ عہد کے زوال پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں وہاں اس دور کے شعراء کے کلام کے نمونے بھی شامل مضمون کرتے ہیں جس میں زوال پذیر معاشرے کی جھلک بخوبی دکھائی دیتی ہے۔ ان شعراء میں سید محمد جعفر زٹلی، سراج اورنگ آبادی، شیخ ظہر الدین خاتم، میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، ولی محمد نظیر اکبر آبادی، انشاء اللہ خان انشا، خواجہ میر درد، علامہ اقبال، قلندر بخش جرات، مصحفی، اور قائم خان چاندپوری شامل ہیں۔

تہذیب:

اقبال کی شاعری میں مغربی تہذیب کے حوالے سے اخلاقی اقدار کی پامالی، مادیت پرستی، عقل پرستی اور نظام تعلیم پر تنقید ملتی ہے۔ علامہ ابن سلطان "دکن میں اردو ادب کا ارتقا" کے عنوان سے دکن میں اردو شاعری کے آغاز کے بہمنی عہد (۱۳۴۶۔۱۵۲۷) سے لے کر بیجاپور، گولکنڈہ نیز ولی دکنی تک کے شعراء کے کلام کا مختصر اجائزہ تجربات، اسالیب اور موضوعات کے حوالے سے لیتے ہیں۔ مضمون کے مطابق یہ خطہ اس عرصے کے دوران دو دفعہ لسانی تبدیلیوں کی زد میں آیا پہلی دفعہ کہ جب اس پر عربوں کی حکومت رہی۔ سندھ پر مجموعی طور پر عربوں نے ۲۸۲ سال تک حکومت کی۔ اس عرصے کے دوران سندھ، ملتان اور گجرات کے علاقوں میں تہذیبی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں نے علم و ادب پر گہرا اثر مرتب کیا۔ اس اختلاط کے نتیجے میں نئے لسانی عمل کا آغاز ہوا۔ تخلیق فن میں نئے تجربات نئے اسالیب اور موضوعات سامنے آئے جب کہ دوسری دفعہ اس خطے کو بیجاپور اور گولکنڈہ پر مغلوں کے قبضے کے بعد لسانی تبدیلیوں سے گزرنا پڑا۔ مضمون

میں اس لسانی ارتقا کو تہذیبی ارتقا سے موسوم کیا گیا ہے۔غالب اردو زبان اور شاعری کو عہد جدید تک لے آئے تھے لیکن پھر ۱۸۵۷ء کے خونیں حادثے نے اسے پھر عہد اکبری میں واپس لوٹا دیا جس میں کچھ حصہ سر سید کی انگریزی تقلید میں لسانی اصلاح کا بھی رہا ہے۔اپنی لسانی تہذیب اور زبانوں کو حقارت کا نشان بنانے کے بعد مسلمان اپنی اجتماعی خود اعتمادی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔غالب کے مختلف موضوعات اور البیلا پیرائیہ بیان کو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی غالب کے معاصرین کی جانب سے رد کیا گیا تاہم بلند غالبی فکر کے اظہار و ابلاغ کو اقبال نے آگے بڑھایا۔اقبال نے جہاں مشرق کے تہذیبی بقا و ارتقا کے لیے اسلامی افکار،عقیدہ اور تہذیب کو بنیاد بنایا وہیں بے خدا مارکسیت کے گماشتوں کی بدولت اردو لسانی اور تہذیبی طور پر نیم جاں ہو گئی اور اس مقام سے آگے نہ بڑھ سکی جہاں اقبال نے پہنچایا تھا۔یوں اردو کو سلسلہ غالب میں اقبال کے جانشین کا انتظار ہے۔

سیاست:

پروفیسر سیدہ نغمہ زیدی کے "سیاسیات مشرق و مغرب اور اقبال" کے مطابق اقبال ملوکیت اور سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی جمہوریت کے خلاف تھے اور اشتراکیت کے لیے بھی پسندیدگی کا اظہار صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ بھی اسلام کی طرح تمام طبقوں کے حقوق کی بات کرتا ہے لیکن اس کے نزدیک نظام اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا نظام انسانیت کی ترقی کا معراج نہیں ہو سکتا اور اقبال کو مسلم ریاست کی شکل صرف ایران میں ہی نظر آئی نظر آئی۔اقبال اپنی شاعری میں کھل کر مغربی نظام سیاست پر تنقید کرتے ہیں۔علامہ اقبال کے سیاسی نظریات کا اظہار "اشتراکیت کے نام"،"سیاست افرنگ"،"ابلیس کی مجلس شوریٰ"،"ابلیس خاکی ابلیس ناری"،"مسولینی" اور "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں ملتا ہے۔

صادقین جس طرح اپنی مصوری میں انسانی جسموں پر تنی ہوئی نوک دار کانٹوں کی پوشاک اور سروں پر منڈلاتے ہوئے کوؤں اور گدھوں کی علامتوں سے آج کے پر آشوب صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں یہی چیز ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔صادقین نے اگرچہ عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیا تاہم ان کے رباعیات میں یہ اظہار کہیں بلند آہنگی تو کہیں فلسفیانہ طور پر ملتا ہے۔وہ ظلم و استحصال سے پاک معاشرے کے تشکیل کے تمنائی ہیں۔رباعیات کے حوالے سے ان کے کلیات "رباعیات صادقین" کا ذکر ملتا ہے۔

انسان:

محمد طارق غازی کے جمیل الدین عالی سے نشست میں ان کے ایک طویل ترین نظم "انسان" کا ذکر ملتا ہے۔ جس کا موضوع ہے کہ انسان دوامی ہے انسان دوامی نہیں ہے۔یعنی موت کے بعد انسان کے جسد کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن کچھ آدمی مرنے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں جیسے کہ غالب اور اقبال مرنے کے بعد بھی پڑھے جاتے ہیں۔ محمد سلیم خاں کے مطابق احمد ندیم قاسمی ظاہری حسن کی بجائے انسان، انسانی مزاج، انسانی قدر اور انسانیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ان کی نظموں "مری شکست"، "وقت کا چکر"، "طیور آوارہ" اور "نغمہ انسان" میں انسان کے انہی پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے۔

تانیثیت:

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا فہمیدہ ریاض کی شاعری پر تانیثی حوالے سے نظر ڈالتے ہیں۔ان کے مطابق فہمیدہ ریاض نے خواتین کی ذات سے تعلق رکھنے والے ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جس پر عام طور ہر خواتین نہیں لکھتی۔مثلا فہمیدہ ریاض نے فرانسیسی شاعرہ،ڈرامہ نگار اور تانیثیت کی علمبردار فلسفی، نقاد اور ممتاز ماہر ابلاغیات ہیلن سکوس (Helen cixous) کی طرح خواتین کے جسمانی حسن، جنس، جذبات اور احساسات کے متعلق لکھا ہے۔ نیز ان کی نظمیہ شاعری جو تانیثی فکر کے تحت لکھی گئی ہے ان میں "آج شب"، "اب سو جاؤ"، "گڑیا"، "اک عورت کی نرم ہستی"، "وہ اک زن ناپاک ہے"، "مقابلہ حسن"، "لاؤ ہاتھ اپنا ذرا"، "چادر اور چار دیواری"، "انقلابی عورت" اور "گرھستن" کا ذکر ملتا ہے جب کہ اسی مضمون کے ذیل میں ادا جعفری کے نظم "میراث آدم" اور اردو شاعری میں تانیثیت کے اعلیٰ نمونے کے طور پر نظم "شہر آشوب" کا حوالہ ملتا ہے۔

پس نو آبادت:

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا قیام پاکستان کے بعد کے حالات و واقعات کی عکاسی کے حوالے سے فیض احمد فیض کے "صبح آزادی"، احمد ندیم قاسمی کے "ادب اور سیاست"، "یہ رات" اور "غم وطن" کا ذکر کرتے ہیں نیز اسی ذیل میں عبد المجید سالک، مجید لاہوری، دلاور حسین دلاور فگار، محسن بھوپالی، علی سکندر جگر مراد آبادی، محمد افضل قریشی باقی صاحب، احمد فراز، اختر انصاری، اکبر آبادی، اقبال صفی پوری، آغا شورش کشمیری، الطاف گوہر، ابن انشا، ادا جعفری، امین راحت چغتائی، اطہر ہاپوڑی، باقی صدیقی، جگر مراد آبادی، جمیل ملک، حلیل قدوائی، نواب زادہ مرزا جمیل الدین عالی، تابش دہلوی، جعفر علی خان اثر، شبیر حسن

خان جوش ملیح، جون ایلیا، جعفر طاہر سید، حفیظ ہوشیار پوری، حمایت علی شاعر، خاطر غزنوی، رابعہ خاتون، روشن نگینوی، رضا ہمدانی، رضی اختر شوق، ساغر صدیقی، سراج الدین ظفر، سرشار صدیقی، سیف الدین سیف، شان الحق حقی، شہرت بخاری، شہزاد احمد، سید افضل جعفری، ضمیر جعفری، سید ظریف ، ظہیر کاشمیری، عرش ملیحانی، عارف عبد المتین، فاروق احمد محشر بد ایونی، فارغ بخاری، قیوم نظر، قتیل شفائی، ماہر القادری، محسن احسان، محسن بھوپالی، مجید لاہوری، مجید احمد، مشفق خواجہ، منیر نیازی، ن۔م۔راشد، ناصر کاظمی، وزیر آغا اور ہادی مچھلی شیری کا کلام شامل مضمون کیا گیا ہے۔

جدیدیت:

مبصر سید منصور عاقل کے مطابق ڈاکٹر عالیہ امام اپنی کتاب "اکیسویں صدی میں سائنس اور ادب" میں فلسفہ مادیت اور فلسفہ عینیت پر افلاطون کے اس تصور کی روشن میں بحث کرتی ہیں کہ روح مادے کی تخلیق کرتی ہے جب کہ عینینت پسندوں کا ایک گروہ جدیدیت پسند بھی ہے۔اس ذیل میں اینگلز کے سوشلزم، مارکس کے مادی جدلیت اور لینن کے تصورات پر بحث کرتی ہیں اور انہی مباحث کے روشنی میں کلام غالب، اقبال، فراق، جوش اور فیض کا جائزہ لیتی ہیں۔اقبال کے نظموں "لینن خدا کے حضور"، "فرمان خدا فرشتوں کے نام"، "اشتراکیت"، "ابلیس کی مجلس شوریٰ" اور فارسی تصنیف "زبور عجم" کے متعلق اظہار خیال کرتی ہیں کہ اقبال بنیادی طور پر سوشلزم کے مداح ہیں لیکن اقبال کے فکر کی بنیادی ستون اسلام ہے اور اشتراکیت سے پہلے حضورؐ کے زیر قیادت اسلامی ریاست اور اس پہلا تحریری آئین سامنے آچکا ہے اس لیے یہ تو ممکن ہے کہ اشتراکیت نے اسلامی نظام حیات سے استفادہ کیا ہو نہ کہ اس کے برعکس۔یوں بیسویں صدی کا شاعر ہونے کے باوجود اقبال اکیسویں صدی میں سانس لیتا ہے۔

مبصر پروفیسر انوار احمد زئی نوید سروش کے شعری مجموعے "ہم نشینی" پر جدیدیت کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہیں جس کا غالب حصہ غزل پر مبنی ہے تاہم نظم کے سلسلے میں پابند نظم اور نثری نظم کا ذکر کرتے ہیں۔

مابعد جدیدیت:

ساقی فاروقی کی شاعری پر برطانوی شاعر ٹیڈ ہیوجز اور جارج آرویل کے اثرات پائے جاتے ہیں کیوں کہ اس نے بھی ان شعراء کی طرح جانوروں کے جبلت کے موضوع پر متنوع تخلیقی تجربات کیے۔ساقی فاروقی

نے حیوانات کے موضوع پر مبنی شاعری میں دراصل اس عہد کی لرزا خیز بے حسی، جان لیوا ہوس و خود غرضی کو بیان کیا ہے نیز اپنے عہد کے مسائل میں الجھے ہوئے انسان کے مسائل و آلام اور کشمکش روز گار کی لفظی مرقع نگاری ہے۔ طنز و ظرافت سے لبریز ان نظموں میں "ایک کتا"، "شیر امداد علی کا مینڈک"، "ایک سور سے"، "خرگوش کی سرگزشت"، "خالی بورے میں زخمی بلا"، اور "حاجی جان محمد سفر آسان نہیں" شامل ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر شبیر رانا "خالی بورے میں زخمی بلا" اور "مستانہ ہیجڑا" جیسی نظموں کے اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> اس قسم کے موضوعات پر اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھا کر ساقی فاروقی نے اردو ادب کو عہد قدیم کے مسلط کردہ جمود اور بیزار کن یکسانیت، پامال راہوں کی دھول اور کلیسے کی مسموم فضا سے نجات دلائی اور اپنے منفرد اسلوب کے وسیلے سے اردو ادب کو جدیدیت کے حصار سے نکال کر مابعد جدیدیت سے آنکھیں دو چار کرنے کا ولولہ عطا کیا"(۹)

ترقی پسندیت:

احسن حمیدی زندگی کے تضادات کو مارکسی فلسفے کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے جمہوریت دشمن اور عوام کش حالات کی عکاسی اپنے نظموں "ارتقا"، "اب نئی صبح مسکرائے گی"، "دیوار تو کب کی گر چکی" نیز ایوب خان اور مارشل کے دور کے حوالے سے "مرگ احساس"، "شہر بدر"، "آئینہ"، جرگہ "اور ایک طویل تمثیلی نظم "شہر سلاسل" میں کی ہے۔ اردو کی طویل ترین سیاسی مثنوی "جرم آگہی" کا موضوع Establishment کے ہاتھوں شہید ہونے والے کمیونسٹ رہنما نذیر عباسی کی شہادت کے پیش منظر اور پس منظر پر مبنی ہے۔ علامتی نظم "مسئلہ یہ ہے" جنیوا کانفرنس کا پیش منظر و پس منظر پر مبنی ہے نظم کا دورانیہ ۱۲ اپریل ۱۹۸۸ء ہے۔ اس نظم کا موضوع تیسری دنیا اور عالمی منظر نامہ ہے۔

کمیونسٹ نکتہ نظر کے حامل "بابائے سندھ" کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے سندھ کی سماجی، سیاسی اور معاشی نیز تہذیبی اور تمدنی تاریخ کو بطور سیاست دان سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، ان کے خیالات کی عکاسی ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ سندھ میں ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام کے خلاف نہوں نے "جیے سندھ"، "سندھ پیاری" اور "سلام سندھ" میں کھل کر لکھا۔ حیدر بخش جتوئی کا مضموعہ "تحفہ سندھ" ۲۲ رباعیوں، چار غزلوں اور منظومات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں نظم "شکوہ" اور "دریاشاہ" کا شمار اہم نظموں

میں کیا جاتا ہے دوسرا مجموعہ "آزادی قوم" ۷۱ابندوں پر مشتمل ہے جو انگریزی نو آبادیاتی تسلط کے خلاف ہندوستان کے جدوجہد کا ایک رزمیہ ہے۔

فہمیدہ ریاض بھی ترقی پسند فکر کے تحت جبر کے ہر انداز کو مسترد کرتے ہوئے استبدادی طاقتوں کے خلاف اپنی نظموں "خانہ تلاشی"، "کوتوال بیٹھا ہے"، "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے" اور "بعد میں جو کچھ یاد رہا" میں کھل کر لکھا ہے۔ مسلم شمیم، مخدوم محی الدین پر بھی ترقی پسند شاعر کے طور پر بحث کرتے ہیں اس حوالے سے ان کے شعری مجموعے "سرخ سویرا" اور "گل تر" جب کہ نظموں میں "اندھیرا"، "قید"، "جنگ آزادی" اور "چنبیلی کے منڈوے تلے" کو مضمون کا حصہ بناتے ہیں۔

عمرانیات:

۱۸۵۷ء کے بعد کے اہم شعراء میں محمد علی جوہر، علامہ اقبال، سیماب، قابل گلاٹھوی، احسان دانش، جوش ملیح آبادی، ظفر علی خان، انور صابری، شورش کشمیری، نازش پرتاب گڑھی کے ساتھ حامد الانصاری غازی بھی شامل ہیں۔ محمد طارق غازی کے مطابق "مولانا غازی عالم دین تھے، فقہ السیاسیات کے امام تھے۔۔۔ماہر عمرانیات تھے۔۔۔اسلامی تہذیب کے رمز شناس تھے"(۱۰) مولانا ذہنی آزادی کے لیے سیاسی آزادی کو ضروری سمجھتے تھے اور سیاسی آزادی کا دوسرا اہم جزو اقتصادی آزادی ہے۔ مضمون کے مطابق مولانا انقلاب کے لیے اسلامی عمرانیات کی سفارش کرتے ہیں۔ مضمون میں ان کے نظریات کے اظہار کے حوالے سے نظم "جنگ عمل"، "اسلامی ترانہ"، "نوجوانان امت"، "زمزمہ وجود"، "عرفی"، "انجام تمدن"، "اٹھو نوجوانو، بڑھو نوجوانو"، "آہنگ انقلاب"، "بیداری مشرق"، "صبح آزادی"، "سیمابی نظارے"، "کشاکش"، "دھواں ہی دھواں" اور "ہم لوگ" پر بحث کی گئی ہے۔

تاریخ:

صادقین کے کلیات "رباعیات صادقین" میں جزو بوسیدہ" کے زیر عنوان کچھ نظمیں بھی شامل ہیں۔ جن میں "میر اسیارہ"، "کائنات اور ابن آدم"، "غالب اور مارکس"، "افلاطون"، "رومی"، "عمر خیام"، "گوئٹے"، "شیلے"، "رسکن"، "نطشے"، "اقبال" اور "آئن سٹائن" جیسی نظمیں صادقین کے وسعت مطالعہ کا پتہ دیتی ہے جب کہ ان کی قدرے طویل نظم "انسان" دور حاضر کے انسان کا رجزیہ بیان ہے۔ صادقین کے تاریخی شعور سے متعلق ان کا اقتباس شامل کیا گیا ہے جس کے مطابق:

> عصر جدید کا انسان ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں سے اسے اس کی تمام کارفرمائیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ کہیں شعلے بھڑکتے دکھائی دے رہے ہیں کہیں سے گولوں کی آواز اور توپوں کی گرج کانوں میں آرہی ہے؛ کہیں متضاد سیاسی نظریات کی بنا پر زبانی جنگوں کی صدائیں کانوں میں آرہی ہیں؛ کہیں لہو کی ندیاں بہتی دکھائی دے رہی ہیں؛ کہیں کارخانے دکھائی دے رہے ہیں؛ ان میں بنتے ہوئے آلات تباہی پر نظر پڑ رہی ہے؛ کہیں عمودی عمارات بادلوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی نظر آرہی ہے؛ کہیں مشعل علم اور شمع فن کی ضو دکھائی دے رہی ہے؛ کہیں خونی سیاست، نسل و خون کے درختوں کی پر اسرار گھنی چھاؤں میں رقص کرتی نظر آرہی ہے؛ کہیں سرمایہ داروں کا جور دیوار اخلاق میں نقب لگاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے؛ کہیں قندیل تہذیب اور چراغ تمدن کی روشنی آرہی ہے؛ فضا میں طیارے، سمندر میں جہاز اور خشکی پر ریلیں، موٹریں اور ٹینک دکھائی دے رہے ہیں؛ کہیں مشین مہینوں میں ہونے والا کام لمحوں میں انجام دیتی نظر آتی ہے۔[۱۱]

عقیل دانش "اقبال کا قبال" میں علامہ اقبال کا ذکر تاریخی حوالے سے کرتے ہیں کہ اقبال کی اہمیت اور شخصیت دراصل کسی تاریخ داں کا موضوع ہے کیوں کہ اگر برصغیر کے فلسفے، شاعری، سیاست اور دانش وری سے اقبال کو الگ کیا جائے تو ہماری تاریخ ادھوری رہ جائے گی بلکہ اقبال کا مقام تو دنیا کی تاریخ کا حصہ ہے۔

تاثراتی طریقہ کار:

اویس الحسن خان کے مطابق ارشد خالد کی کتاب "پارٹ ٹائم شاعری" پڑھنے والاوں کو عجیب ذائقوں سے روشناس کراتی ہے۔ مضمون میں شامل ایوب خاور کے اقتباس کے مطابق ارشد خالد کی نظموں سے انسان ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے جب کہ عبد اللہ جاوید کے مطابق یہ شاعری ذہن و قلب پر دیرپا اثرات مرتب کرتی ہے۔ شہناز خانم عابدی کے نزدیک ان کے سچے جذبات کی جھلکیاں ان کے نظموں میں نمایاں ہے۔

مجموعہ مضامین "اقبال۔ شاعر فردا" کے مصنف غلام صابر کے دل و دماغ پر اقبال کے درج ذیل شعر نے لازوال اثرات مرتب کیے:

کیوں چمن میں بے صدا مثل رم شبنم ہے تو　　　لب کشا ہو جا، سرود بربط عالم ہے تو[۱۲]

اس شعر کے لازوال اثرات کی بدولت ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کلام اقبال کے اثرات سے ملت اسلامیہ کے ہر نوجوان کے دل میں بھی علم و محبت کی شمع روشن ہو جائے۔ اس مقصد کے بر آوری کے لیے ان کی نظر انتخاب "طلوع اسلام"، ابلیس کی مجلس شوریٰ"، "مسجد قرطبہ"، "ساقی نامہ"، "آواز غیب" اور "تن بہ تقدیر" پر پڑتی ہے۔

رومانیت:

اویس الحسن خان، فرحت نواز کی کتاب "استعارہ میری ذات" پر رومانیت کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے اس مجموعے پر زیادہ تر نظموں کے حوالے سے بحث ملتی ہے جن میں "رقص وحشت کروں"، "بن باس میں ایک دعا"، "منت کے دھارے"، "نا انصافی"، "جائے پناہ"، "تیز چلتی ہوا نے تماشا کیا"، "مجھے ایک نظم لکھنی ہے"، "ایک مشکل"، "بچھڑتے لمحوں میں" اور "دعا" شامل ہے۔ مضمون میں پروفیسر مظہر مہدی درج ذیل اقتباس میں مجموعے پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> محبت کا موضوع اتنا پرانا ہے جتنا کہ آدم و ہوا کا قصہ اور اتنا ہی نیا ہے جتنا ہم سب کی زندگیوں میں چاہے اور چاہے جانے کا جذبہ موجود ہے اور اس لیے فرحت نواز کی شاعری میں محبت کی مختلف النوع کیفیات کو عمومی طور پر دیکھا جا سکتا ہے"[۱۳]

جعفر طاہر کے نظم "جھولا" پر فرانسیسی رومانوی تحریک کے اہم شعراء جن میں ہیوگو (Hugo) اور لیمارٹن (Lemartine)، مُسیٹ (Musset) اور ڈی وگنے (Devigny) کے غنائی شاعری کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

ہیئتی طریقہ کار:

اردو شاعری میں سہرا نگاری پر طبع آزمائی تقریباً ہر بڑے شاعر نے کی ہے۔ عام طور پر شادی بیاہ میں گائے جانے والے یہ گیت بہ خطابیانہ انداز میں بصورت غزل، مثنوی بہ اعتبار مضمون قصیدہ سے مشابہ ہوتی ہے لیکن سید نظام شاہ رامپوری سہرا نگاری کو مثلث کی ہیئت میں لکھ کر نئی جدت لانے کا سبب بنے ہیں، جس کے پہلے بند کے تینوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جب کہ باقی تمام بندوں میں آخری مصرع پہلے بند کے ہم قافیہ ہوتا ہے۔ نیشنل فاؤنڈیشن اسلام آباد نے ۲۰۱۶ء میں اس شاعر کا منتخب کلام شائع کیا جس میں سہرے کے ذیل میں انہوں نے ہر شعر کو دوبیتی کی صورت میں کر کے تیسرا مصرع حذف کر دیا ہے جس سے نظام شاہ کا یہ شعری اختصاص نمایاں نہ ہو سکا۔

عروض و تقطیع:

سرور عالم راز سرور "رموز رباعی" میں رباعی کے عروض کے اصول اور تقطیع کے بحث کے بعد فانی بدایونی، شیخ امام بخش ناسخ، امیر مینائی، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، قتیل شفائی اور عزیز بریلوی کے رباعیوں کو زیر بحث لاتے ہیں۔

ب۔ الاقرباء میں غزل پر مبنی آرٹیکل بلحاظ افکار و طریقہ کار:

مابعد الطبیعات / مذہب:

ابو الفاضل راز سرور چاندپوری کی تصوف سے دلچسپی ان کے کلام سے مترشح ہے۔ ان کے مضامین میں فطرت و کائنات، خودی و بے خودی اور تقدیر و تدبیر پر مبنی موضوعات کی کثرت ہے۔ سرور عالم راز کے مطابق:

> "راز خالق کائنات کو مظاہر فطرت میں ہی دیکھتے ہیں اور تمام عالم کو اس کا نگار خانہ جان کر عرفان الٰہی کے منزلوں تک پہنچتے ہیں۔۔۔ ان کے یہاں خود پرستی اور حق پرستی میں کوئی فرق نہیں۔۔۔ بلکہ یہ وہی خود پرستی ہے کہ ہر منصور کو دار و رسن کی جان لیوا راہ سے عرفان حق تک لے جاتی ہے۔"[۱۴]

مبصر اویس الحسن کے مطابق "حرف اضطراب" میں غلام رسول زاہد کی شعری کائنات کا محور متصوفانہ افکار و خیالات پر قائم نظر آتا ہے جس کی مثالیں جابجا شعری مجموعے میں ملتی ہیں۔ فرزانہ اعجاز، والی عاصی کا ذکر بھی ایک صوفی مزاج شاعر کی حیثیت سے کرتی ہے۔ سانحہ کربلا کو خراج عقیدت شعر و ادب کا ایک ایسا موضوع ہے کہ جس نے ابدیت اختیار کر لی ہے۔ ڈاکٹر فریاد آزر کے یہاں شہدائے کربلا کو بھی خراج عقیدت کا موضوع ملتا ہے۔ نیز ڈاکٹر فریاد آزر کے یہاں انسانی عظمت اور احترام آدمیت کا موضوع بھی ملتا ہے بلکہ وہ اس ضمن میں آنحضورؐ کے سفر معراج کا کنایہ کچھ یوں استعمال کرتے ہیں۔

مرے سفر کو تو صدیوں گزر گئیں لیکن　　　　فلک پہ اب بھی ہے قائم نشان پا میرا[۱۵]

عشق حقیقی:

جگر مراد آبادی کے یہاں عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کے رنگ بھی ملتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ

وحدت الوجودی نظریے کے حامل نظر آتے ہیں جب کہ بعض اشعار نظریہ وحدت ادیان کی ترجمانی کرتے ہیں جیسے کہ:

کیسا مجاز اور کیسی حقیقت اپنے ہی جلوے، اپنے ہی سائے
پینے سے کام ہے ہمیں میکدہ حیات میں ظرف جدا جدا سہی، اصل جدا جدا نہیں (۱۶)

حسن و عشق:

جگر مراد آبادی کی شاعری پر عشق کا جذبہ غالب ہے۔ اس ضمن میں ان کے یہاں ابتدائے عشق کی گہری اور والہانہ کیفیات، عشق کے ظاہری معاملات، جسم یار کی کشش، اور حسن و عشق کے نازک اور لطیف نفسیات اور کیفیات کا بیان ملتا ہے۔ ڈاکٹر تابش کے مضمون کے مطابق عقیل دانش بھی فکری و معنوی سطح پر نہ صرف حسن و عشق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اسے مکمل طور پر اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ میر کے کلام میں واردات قلبی اور درد و الم کے بیان میں عشق بنیادی وجہ ہے، جس کی تقلید غالب، نظام، داغ، امیر اور جلال نے تقلید کی۔ میر کی تقلید میں ان شعرا کے غزلوں کے نمونے فراہم کیے گئے ہیں۔

عصری شعور:

عقیل دانش کی شاعری میں روح عصر بھی ہے اور عصری حسیت بھی۔ ان کے یہاں صرف عام زندگی کے شب و روز کے مسائل اور عام انسان کے استحصال کے خلاف احتجاج ہی نہیں ملتا بلکہ ان مسائل کا مردانہ وار مقابلے کا پیام بھی ملتا ہے۔ مبصر سید منصور عاقل، کے مطابق ڈاکٹر فریاد آذر کے یہاں خاص چیز جو کثرت سے ملتی ہے وہ ہے ان کا عصری شعور اور اس کا کرب۔ جس کے تحت ان کے اشعار میں کبھی فلسطین کا ذکر ملتا ہے تو کبھی بوسنیا کا اور کبھی وادی کشمیر کی آگ کا ذکر ہیں تو کبھی آتش گجرات کی بات کرتے ہیں۔ ڈاکٹر دلاور شاہ کے مطابق کرامت بخاری کی غزل میں ہمیں سوز گداز کے ساتھ عصری صداقتوں کا سارا منظر نامہ ملتا ہے وہ ماضی و حال کے احوال پر کھڑی نظر رکھتے ہیں۔

نفسیات:

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا کے مضمون کے مطابق یوسف حسن کے ماورائی نفسیات میں دلچسپی دراصل علم نجوم اور قیافہ شناسی کی بدولت پیدا ہوئی۔ وہ ان پر اسرار حالات میں اپنے خیالات، تجربات،

جذبات،مشاہدات اور خاص ذہنی کیفیات کو اشعار کی صورت میں ڈھالنے کے لیے آئینہ، منڈیریں، نظر، خیمہ، کاسہ، دریا، خشت، کنارہ، تیشہ، زنجیر، خواب، دیوار اور خاک کی علامتیں استعمال کرتے ہیں۔

جدیدیت:

مبصر انوار احمد زئی، نوید سروش کے شعری مجموعے "ہم نشینی" پر جدیدیت کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہیں۔ ان کے مطابق:

"نوید سروش نے نئے تجربے بھی کیے ہیں اور یہ تجربے ساختیاتی بھی ہیں اور جدلیاتی بھی۔ فکری تجربوں کی کاوش میں وہ طرز ادا کے لیے ندرت کے متلاشی ہیں جب کہ ہیئت میں رنگ ادا کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں انتہائی مختصر بحر میں اڑتالیس اشعار پر مشتمل غزل ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے جس کا ابتدائی انداز کچھ یوں ہے۔

ہیلو ڈیئر　　　ملتا کہیں
تم ہو کدھر　　　اپنا ہی گھر
ملتی نہیں　　　جلتا ہے کیوں
کوئی خبر　　　میرا نگر"(۱۷)

نوید سروش، صابر ظفر کی مرتب کردہ کتاب "چار جدید شاعر" پر حیرت کا اظہار کر رہے ہیں کہ صابر ظفر نے خود کو چار جدید شاعروں میں شامل کیا ہے اور اپنے ہی کلام کا انتخاب جیسے مشکل کام کو بھی صابر ظفر نے خود انجام دیا۔ ان چار جدید شعراء میں ظفر اقبال، راجیندر پنچندہ بانی، پروین کمار اشک اور صابر ظفر شامل ہیں۔ یہ چاروں شعراء مختلف تجربوں کے حوالے سے بھی مقبولیت رکھتے ہیں۔

تانیثیت:

تانیثیت کے ایک معتبر و موقر حوالے کے طور پر ادا جعفری کا ذکر کیا جاتا ہے جو کہ خواتین کے معاشرتی زندگی کے کٹھن مسائل اور صبر آزما حالات کی لفظی مرقع نگاری اتنی مہارت سے کرتی ہیں کہ قاری ان کے تجربات و مشاہدات کو اپنی قلبی کیفیات سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ ادا جعفری کی شاعری سے اسی ذیل میں مثالیں دی گئی ہیں۔

ترقی پسندی / فلسفہ مادیت:

فیض احمد فیض اپنی شاعری میں عدم توازن کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ان کے یہاں انفرادیت و اجتماعیت دونوں پہلو ملتے ہیں۔وہ اپنی فکر کو زندگی کے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ ترقی پسندی کا عنصر لیے ہوتی ہے۔فراق گورکھپوری کا سماجی شعور ان کے ترقی پسندانہ نظریات کا عکاس ہے۔ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہندوستانی تہذیب، تمدن، عقائد، افکار اور سماجی زندگی کی بھرپور ترجمانی ہے۔ان کی پوری شاعری کو عشقیہ شاعری کا جو نام دیا گیا ہے دراصل ترقی پسندانہ جمالیات سے عبارت ہے جو کہ سچائی اور خلوص پر مبنی ہے۔ مسلم شمیم کے مطابق "فراق ترقی پسند شاعری، ترقی پسند فکر اور نظریے کی پہچان تھے بلکہ میرے نزدیک فراق اور ترقی پسند شاعری، ترقی پسند نظریہ اور ترقی پسند تحریک مترادفات Synonyms کا درجہ رکھتے ہیں۔" [۱۸] مبصر اویس الحسن، غلام رسول زاہد کی کتاب "حروف اضطراب" پر ادب برائے زندگی کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہیں۔ڈاکٹر عالیہ امام کتاب "اکیسویں صدی اور ادب" میں فلسفہ مادیت اور عینیت پر افلاطون کے اس تصور کی روشنی میں کہ روح مادے کی تخلیق کرتی ہے پر بحث کرتی ہے جب کہ عینیت پسندوں کا ایک گروہ جدیدیت پسند بھی ہے۔ڈاکٹر عالیہ امام کے مطابق "فلسفہ لاادریت" بھی فسلفہ عینیت ہی کا بازگشت ہے۔ مفکر اینگلز کے سوشلزم کو کارل مارکس نے "جدلی مادیت کا نام دیا جب کہ لینن کے نزدیک انسان کی لڑائی محض معاشی نہیں بلکہ کلچر اور تہذیبی بھی ہے۔ مضمون نگار اسی تناظر میں غالب ،اقبال، فراق، گورکھپوری، جوش اور فیض پر بحث کرتی ہیں۔ مصنفہ اکیسویں صدی کو سائنس کی صدی قرار دیتے ہوئے غالب کے کلام سے سائنسی موضوعات کے حامل اشعار کی خوشہ چینی کرتی ہیں۔جب کہ جوش پہلا انقلابی ہے جس کے انقلاب کی اساس مادی فلسفہ حیات اور عقل پرستی پر قائم ہے۔باب فیض کے ذیل میں اس بحث کا خاتمہ درج ذیل شعر پر کیا گیا ہے۔

غرور سرو سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والی چمن تھے ورود سمن سے پہلے [۱۹]

رومانیت:

سرور راز عالم سرور، راج کمار قیس کے غزلیات کے مجموعے "صحرا صحرا" پر رومانیت کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہیں کہ قیس ایک رومان پسند جذباتی شاعر ہیں اور یہ سیدھا سادہ اور شائستہ ذہن والا رومان پرست

شاعر اپنے جذبات و احساسات اور خیالات کو سیدھے سادے طریقے سے قاری تک پہنچاتا ہے۔ انہوں نے اگرچہ فراق گورکھپوری کے طرز تفکر اور داغ دہلوی کے انداز بیاں کو اپنانے کی کوشش کی تاہم اس میں کامیاب نہ ہوسکے تاہم مجموعی طور پر یہ شعری مجموعہ قاری پر خوش گوار اثرات چھوڑتا ہے۔ غزلیہ شاعری میں انور جہاں برنی اپنے لطیف جذبات میں قاری کو بھی بصد خلوص اور محبت شامل کرتی ہے۔

عروض اور تقطیع:

مبصر ڈاکٹر غلام شبیر رانا، پروفیسر عزیز جبران کی کتاب "عروض اور تقطیع" کے اٹھارہ ابواب کا تعارف کراتے ہیں کہ عزیز جبران تقطیع کے قواعد پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں بلکہ اشعار کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے بعد متعلقہ بحر کے ساتھ مطابقت کراتے ہیں۔ نیز عربی، فارسی اور اردو زبان میں شعر کے تخلیق، لاشعوری محرکات، وزن، موزونیت، ارکان، تقطیع، زحاف، سالم، مثمن، مسدس اور مربع کے حوالے سے تمام حقائق یکجا کرتے ہیں۔ ولی عالم شاہین کے تبصرے کے مطابق مامون ایمن کی کتاب "صبا اکبر آبادی ایک ہمہ جہت شاعر" کے پہلے باب میں صبا اکبر آبادی کی شاعری کا جائزہ بحوالہ اوزان اور تقطیع کے لیا ہے۔

حوالہ جات

۱. جلیل عالی، ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں (مضمون)، مطبوعہ: ادبیات، شمارہ ۲۰۱۸، ۱۰۸ء، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۲۷۱۔ ۲۷۲

۲. ایضاص ۲۷۶۔

۳. خاور اعجاز، احمد ندیم قاسمی کی غزل (مضمون) ایضا، ص ۲۹۴

۴. مبصر سہیل اختر، پروفیسر، سرکار دو عالمؐ، (مضمون)، مطبوعہ: الاقربا، شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶، ص ۲۹۸

۵. سید انتخاب علی کمال، اردو میں غیر منقوط نگارشات نظم و نثر و تاریخ گوئی کے حوالے سے (مضمون) ایضاً، شمارہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۹

۶. سیدہ نغمہ زیدی، پروفیسر، اقبال اور برگساں (مضمون)، سالنامہ ۲۰۱۸ء، ص ۱۱۶

۷. محمد فیصل مقبول عجز، مرزا نظام شاہ لبیبؔ کی ایک منفرد نظم۔۔۔الو" (مضمون) ایضا، ص ۵۶

۸. مبصر شاہدہ دلاور شاہ، ڈاکٹر، تنقیدی نظریات (تبصرہ) ایضا، ص ۲۵۶۔ ۲۵۷

۹. پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا/ ساقی فاروقی: اس ایک آن میں سب کچھ تباہ کر کے نہ جا (مضمون) ایضا، ص ۱۸۹

۱۰. محمد طارق غازی، حامد الانصاری غازی کی شاعری (مضمون)، ایضا، ص ۱۵۹

۱۱. مسلم شمیم، صادقین ایک خلاق مصور و مفکر (مضمون) ایضا، شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۵ء ص ۹۳۔ ۹۴

۱۲. مبصر سید منصور عاقل، اقبال شاعر فردا (تبصرہ)، ایضا، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۷، ص ۲۴۸

۱۳. مبصر اویس الحسن خان، استعارہ میری ذات کا (تبصرہ)، ایضا شمارہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۶ء، ص ۳۰۵۔ ۳۰۶

۱۴. سرور عالم راز سرور، ابو الفاضل راز سرور چاند پوری، شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۵، ص ۲۷،

۱۵. مبصر اویس الحسن، حرف اضطراب (تبصرہ) ایضا، شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۲۸۰

۱۶. ڈاکٹر محمد شہاب الدین، جگر مراد آبادی کی انفرادیت (مضمون) ایضا، شمارہ سالنامہ ۲۰۱۹ء، ص صفحہ ۹۱

۱۷. مبصر پروفیسر انوار احمد زئی، ہم نشینی (تبصرہ)، ایضا، سالنامہ ۲۰۱۶ء، ص ۳۰۱

۱۸. مسلم شمیم، فراق گور کھپوری۔۔۔ جمالیات کا شاعر (مضمون)، ایضا، سالنامہ ۲۰۱۹ء، ص ۲۴۔

مبصر سید منصور عاقل، اکیسویں صدی میں سائنس اور ادب (تبصرہ)، ایضا جنوری تا جون ۲۰۱۶ء، ص ۲۸۸

باب پنجم:

ماحصل

مجموعی جائزہ:

صحافت بنیادی طور پر خارجی مواد پر مبنی جذبات سے عاری پیشہ ورانہ عمل ہے۔ جس کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ بتدریج کم ہو کر ختم ہو جاتی ہے جب کہ ادبی صحافت کو جذبات و احساسات کی بنیاد پر اہمیت حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کی تاثیر نہ صرف تا دیر رہتی ہے بل کہ ہر دور کے قاری کے لیے فرحت و انبساط کا باعث ہوتا ہے۔ ادبی صحافت کے زمرے میں زبان و ادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین، شعری و نثری ادب کے نمونے، کتابوں پر تبصرے، زبان و ادب کے مسائل پر فیچر اور ادبی و لسانی صورت حال پر ادیبوں کی رائے شامل ہوتی ہے۔ یوں ادب کی اشاعت و فروغ میں ادبی مجلوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیوں کہ انہی مجلوں کے توسط سے ادبی تخلیقات اور تحقیقی و تنقیدی مباحث کی رسائی عوام تک ہوتی ہے۔ یوں ادبی مجلے زبان و ادب کے ساتھ تحقیق و تنقید کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں مجلاتی صحافت کا آغاز "Asian Miscellency of Bengal Register"، "کلکتہ میگزین"، "اورینٹل میوزیم"، "کلکتہ منتھلی"، "ڈگ درشن"، "سماچار درپن" اور "فرینڈز آف انڈیا" سے ہو جاتا ہے۔ اردو صحافت کے آغاز میں "جام جہاں نما" اخبار کو اور مجلاتی صحافت کے آغاز میں "خیر خواہ ہند" کو اولیت حاصل ہے لیکن ادبی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ "قرآن السعدین" سے ہو جاتا ہے جب کہ باقی مجلے جیسے کہ "خیر خواہ ہند" یعنی "محب ہند"، لاہور کے "ہمائے بے بہا"، "معلم ہند" اور "خورشید" سیالکوٹ کے "نور علی نور" اور آگرہ کے "معید خلائق" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ادبی جریدہ نگاری کے فروغ میں مولوی کریم الدین کے گلدستے "گل رعنا" نے بھی اہم کردار ادا کیا جس کے طرز پر دیگر مجلے جیسے آگرہ سے "گلدستہ معیار الشعرا" اور بنارس سے "گلدستہ گلزار ہمیشہ بہار" شائع ہونا شروع ہوئے۔ ادبی صحافت کے فروغ میں "اودھ پنچ" کا کردار بھی اہم رہا ہے جس کی دیکھا دیکھی "سرپنچ ہند"، "لکھنو"، "پنجاب پنچ"، "شریر"، "تیس مار خان"، "لاہور"، "کلکتہ پنچ" اور "دہلی پنچ" کی اشاعت شروع ہوئی۔ تاہم صحیح معنوں میں اردو صحافت کا آغاز سرسید کے "تہذیب الاخلاق" سے ہو جاتا ہے جس کی بدولت اردو میں سلاست و سادگی کو فروغ ہوا نیز انشائیہ جیسی صنف سے بھی اردو روشناس ہوئی۔ سرسید کے ادبی جہت کو "صلائے

عام"،"رسالہ دلگداز" اور "اردوئے معلی" نے آگے بڑھایا۔ تقسیم سے قبل کے مقبول عام جریدوں میں "مخزن"،"ستارہ"،"صبح"،"الہلال"،"ادبی دنیا"،"ساقی"،"شاہکار"،"ہمایوں"، "نگار" اور "ادب لطیف" شامل ہیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۹۹ء تک سامنے آنے والے اہم شماروں میں "چٹان"،"نقوش"،"قومی زبان"،"سنگ میل"،"اردو ادب"،"ماہ نو"،"اسلوب"،"فنون"،"سیپ"،"اوراق"، "تخلیق"،"پاکستانی ادب"،"معاصر"،"حروف"،"چہار سو"،"نقاط"،"اردو نامہ"،"الحمرا"،"الاقربا"،"ارتقا"،"سحر"،"فانوس"،"چراغ" اور "سویرا" شامل ہیں۔اکیسویں صدی میں بھی ادبی مجلوں کی ایک طویل تعداد سامنے آئی جو کہ فروغ ادب کے ساتھ ساتھ معاشرتی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

نتائج

ادبی تحقیق کے فروغ میں ادبی مجلوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیوں کہ ان مجلوں کے توسط سے نئے تحقیقی و تنقیدی مباحث سامنے آتے ہیں۔نئے محققین،نئے اسکالرز انہی مجلوں کے توسط سے ان مباحث سے روشناس ہوتے ہیں اور یہی سے رہنمائی لیتے ہیں اور تحقیق کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں۔یوں یہ مجلے جہاں تحقیق کے نئے زاویے،نئے موضوعات متعارف کراتے ہیں وہیں ادبی تحقیق کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی ترویج میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو سہ ماہی "ادبیات" اور "الاقربا" اپنے منشور اور متعین مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہیں۔"ادبیات" کے منشور میں ایک ادبی اور تخلیقی مجلے کا اجرا شامل تھا تو اگر دیکھا جائے تو ۲۰۱۵ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک کے ادبی مجلوں میں اردو تحقیق کے ضمن میں ۲۴۱ مضامین شائع ہو چکے ہیں جو کہ افسانوی و غیر افسانوی نثر،لسانیات اور تحقیق و تنقیدی نیز شعری مضامین پر مبنی ہیں جب کہ "الاقربا" نے فنون لطیفہ کی بقا اور اخلاقیات سے مرصع شعر و ادب کے ذریعے معاشرے کو پرامن بنانے کی خواہش کو تعین مقاصد میں شامل کیا تھا۔اس ضمن میں ۲۰۱۵ء سے لے کر ۲۰۲۰ء کے مجلوں میں اردو تحقیق کے ضمن میں ۱۸۵ مضامین شائع ہو چکے ہیں جو کہ افسانوی و غیر افسانوی مضامین،لسانیات اور تحقیقی و تنقیدی مضامین اور شعری مضامین پر مبنی ہیں۔ مختصراً اردو تحقیق کے فروغ میں ان مجلوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

تجزیہ مشتملات کے تحت "ادبیات" کے ۲۴۱ مضامین کا مطالعہ اصناف کے لحاظ سے، افکار کے لحاظ سے اور طریقہ کار کے لحاظ سے کیا گیا۔ جن میں سے افسانوی و غیر افسانوی مضامین کے باب (یعنی دوسرے باب) میں ۱۹۹ آرٹیکلز زیر مطالعہ آئے۔ افسانوی آرٹیکلز کے زمرے میں افسانے سے متعلق ۴۳ آرٹیکلز کا مشاہدہ ہوا۔ ان مضامین میں افسانوں پر افکار کے ذیل میں سیاست، معیشت، سماج/معاشرت، تہذیب، نفسیات کے تحت ادبی نظریات میں وجودیت اور جدیدیت نیز طریقہ کار کے ذیل میں رومانیت اور اسلوب کے حوالے سے بحث ملتی ہے۔ ناول کے سے حوالے سے ۱۴۸ مضامین کا مطالعہ کیا گیا جس میں ناولوں کو مابعد الطبیعات، معاشرت/سماج، تہذیب، معیشت، سیاست، سقوط مشرقی پاکستان، نائن الیون، دہشت گردی، آدرش پسندانہ رویہ اور نفسیات کے تحت جب کہ ادبی نظریات و طریقہ کار کے ذیل میں نو آبادیات، مابعد نو آبادیات، رد نو آبادیات، تانیثیت، لایعنیت، تاریخیت و نو تاریخیت، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور ماحولیات ،ترقی پسندی، تاریخ، رومانیت، تقابل اور ہیئت کے حوالے سے زیر بحث لایا گیا۔ غیر افسانوی حصے میں "ادبیات" میں صرف سوانح عمری سے متعلق چھ مضامین کا مطالعہ کیا گیا۔ جن میں سے چار مضامین تنقید پر جب کہ انتظار حسین کے سوانح عمریوں کو تاریخی قرار دیا گیا ہے۔ لسانیات اور تحقیق و تنقید سے متعلق مضامین کے تجزیاتی مطالعے میں "ادبیات" کے مجلے میں لسانیات کے زمرے میں دو مضمون ملتے ہیں جب کہ تحقیق و تنقید کے زمرے میں ۲۰ مضامین کا مطالعہ کیا گیا جو کہ افکار و طریقہ کار کے حوالے سے تصوف، سماجی شعور، مقدمہ شعر و شاعری، تدوین کے جدید اصول، فلسفہ جمالیات اور مابعد جدیدیت، لبرل علوم اور ڈی کنسٹرکشن، ترقی پسند/مادیت پسند، اسلوب، تاریخی و سوانحی تحقیق اور اسلوبیات پر مبنی تھے۔ تنقیدی رجحانات کے ذیل میں زیادہ تر تشریحی اور تجزیاتی طریقہ کار کے تحت حالی کے تنقیدی نظریات کی وضاحت مقدمہ شعر و شاعری کے حوالے سے کی گئی تھی نیز انتظار حسین کے تنقیدی نظریات کی وضاحت اور ان کے ناقدین کے کام پر مبنی ہے۔ شعری مضامین کے تجزیاتی مطالعے میں ۲۲ مضامین کا مطالعہ کیا گیا۔ ان مضامین میں نظم پر مذہب، ملت، انسان اور سیاست اور ادبی نظریات میں تانیثیت اور ترقی پسندیت کے حوالے سے بحث ملتی ہے۔ جب کہ غزل کو سماج، عظمت انسان، حسن و عشق اور جدید شاعری کے تحت زیر بحث لایا گیا ہے۔

ادبی مجلے "الاقربا" میں ۲۰۱۵ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک ۱۸۵ آرٹیکلز کا تجزیہ مشتملات کے تحت جائزہ بطور اصناف، افکار اور طریقہ کار کے تحت لیا گیا۔ ان میں افسانوی و غیر افسانوی نثر پر مبنی مضامین کی

تعداد ۳۵ تھی۔ ان ۳۵ مضامین میں افسانے سے متعلق ۱۸ آرٹیکلز کا مشاہدہ ہوا جن میں افسانے پر معیشت، سماج، موت، تہذیب، نفسیات، تانیثیت اور جدیدیت، تاثراتی، تقابل، ساختیات اور رومانوی طریقہ کار کے حوالے سے بات کی گئی ہے جب کہ ناول سے متعلق ۵ آرٹیکلز میں مابعد الطبیعات، سماج، سیاست، تہذیب اور تانیثیت کے مضامین دیکھنے کو ملے۔ ۳۵ آرٹیکلز میں سے ۱۲ مضامین غیر افسانوی نثر سے متعلق تھے۔ ان میں سوانح عمری پر تاریخ، سفر نامے پر سماج، تہذیب، ثقافت، وطن پرستی اور تاریخ کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی مضامین پر سماجی تناظر میں بحث ملی نیز تاریخی طریقہ کار کے تحت اردو میں طنز و مزاح کی روایت بھی پڑھنے کو ملی۔ باب سوم میں لسانیات کے ذیل میں ۱۷ مضامین کا مطالعہ کیا گیا جس میں زیادہ تر املا، رسم الخط، لغت، نیز تاریخی طریقہ کار کے تحت زبانوں کی تاریخی حقائق پڑھنے کو ملے جب کہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کی تعداد ۳۳ رہی۔ جو کہ ادب اطفال، نثر غالب، ادبی صحافت، تنقیدی دبستان کے اصول، طریقہ کار کے تحت سوانحی اور تاریخی تحقیق کے تحت ساختیات روسی ہئیت پسندی، رومانیت، تانیثیت پر مبنی تھے نیز تنقیدی مضامین کے زمرے میں زیادہ تر کتابوں پر تبصرے ہی ملے جن کے موضوعات میں نفسیات، تحقیقی صورت حال، تقاریز اور تاریخ شامل ہے۔ شعری مقالات کے ذیل میں نظم و غزل پر مبنی ۱۰۰ مضامین کا مطالعہ کیا گیا۔ ان میں نظم پر مذہب، مابعد الطبیعات، ملی شاعری، تصور ارتقا، سماج، تہذیب، سیاست اور انسان، تانیثیت، پس نو آبادیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ترقی پسندی، عمرانیات، تاریخ، تاثرات، رومانیت اور ہئیت کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ غزلوں پر مبنی مضامین میں مابعد الطبیعات، حسن و عشق، عشق حقیقی، عصری شعور، نفسیات، جدیدیت، تانیثیت، فسلفہ مادیت / ترقی پسندی، رومانیت اور عروض و تقطیع کے حوالے سے بحث ملتی ہے۔

مختصراً یہ مجلے نہ صرف ادبی شعور میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں بلکہ اردو تحقیق اور زبان کے فروغ میں بھی اپنا کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں۔

تجاویز:

۲۰۱۵ءسے لے کر ۲۰۲۰ءتک ادبیات اور الاقرباکے مجلوں کے تنقیدی جائزے سے حاصل شدہ حقائق ثابت کرتے ہیں کہ ادبی تحقیق کے فروغ میں یہ مجلے اپنا کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں تاہم ان میں مزید بہتری کی گنجائش ہے جیسے کہ اس مخصوص عرصے میں ادبیات میں شائع ہونے والے ۲۴۱ مضامین کا غالب حصہ ناول، افسانہ ادبی تحقیق اور نظم و غزل کے موضوعات پر مبنی تھا جب کہ لسانیات کے حوالے سے صرف دو مضامین شائع ہوئے اور غیر افسانوی حصے میں ڈرامہ نویسی، سفر نامے، طنز و مزاح اور کالم نویسی سے متعلق کسی قسم کا مواد سامنے نہیں آیا۔ یوں اس مجلے میں اگر ان اصناف پر بھی توجہ دی جائے تو تحقیق کی راہوں میں مزید وسعت آسکتی ہے۔

ادبی مجلے الاقربا کی اگر بات کی جائے تو اس مجلے نے جہاں ادبی تحقیق و تنقید کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا وہیں بین الاقوامی سطح پر بھی اردو ادب کے فروغ کا باعث بنا۔ لیکن کرونا وبا کے باعث ۲۰۲۰ءکے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی جو کہ اردو کا نقصان عظیم ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ جلد ہی اس کی اشاعت دوبارہ ممکن کی جا سکے گی نیز اس مجلے میں ۲۰۱۵ سے ۲۰۲۰ تک کے دورانیہ میں کچھ مضامین اور مضامین میں کچھ پیراگراف کی تکرار دیکھنے کو ملی۔ اس لیے ہم یہ بھی امید کرتے ہیں کہ اس دفعہ ان مسائل پر بھی قابو پانے کی کوشش کی جائے گی۔

سفارشات

تحقیق اور مجموعی جائزے کے بعد درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱. مقالے میں تحقیق کا دائرہ کار صرف "ادبیات" اور "الاقرباء" کے تحقیقی مضامین کا مطالعہ بلحاظ اصناف،،افکار اور طریقہ کار تک محدود تھا۔ جس میں مختلف اصناف نیز لسانیات، تحقیق اور تنقید کے ضمن میں بھی بہت سے طریقہ کار سامنے آئے۔نئے محققین ان موضوعات اور طریقہ کار کے حوالے سے بھی کام کرکے اس میں توسیع کر سکتے ہیں۔

۲. اس طریقہ کار کے تحت ماہنامہ "اخبار اردو" یا" عکاس انٹرنیشنل" کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے۔

۳. ان مجلوں میں شائع ہونے والے انٹرویوز پر بھی تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

۴. نیز ان مجلوں کے تخلیقی ادب کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

کتابیات:

بنیادی مآخذ

۱. ادبیات (سہ ماہی) ادبیات اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ ۱۰۴، جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء،

۲. ادبیات (سہ ماہی) ایضا، شمارہ ۱۰۵، اپریل تا جون، ۲۰۱۵ء۔

۳. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۰۶، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۵ء،

۴. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۰۷، اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۱۵ء،

۵. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۰۸، جنوری تا جون، ۲۰۱۶ء،

۶. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۱۱۔ ۱۱۲، جنوری تا جون، ۲۰۱۷ء،

۷. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۱۳، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۷ء،

۸. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۱۶۔ ۱۱۷، اپریل تا ستمبر، ۲۰۱۸ء،

۹. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۱۸، اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۱۸ء،

۱۰. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۱۹، جنوری تا مارچ، ۲۰۱۹ء،

۱۱. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۲۱۔ ۱۲۲، جولائی تا دسمبر، ۲۰۱۹ء،

۱۲. ادبیات (سہ ماہی)، شمارہ ۱۲۳۔ ۱۲۴، جنوری تا جون، ۲۰۲۰ء،

۱۳. الاقربا (سہ ماہی) الاقربا فاؤنڈیشن اسلام آباد، سالنامہ ۲۰۱۵ء

۱۴. الاقربا (سہ ماہی)، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۵ء

۱۵. الاقربا (سہ ماہی)، اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۱۵ء

۱۶. الاقربا (سہ ماہی)، سالنامہ، ۲۰۱۶ء

۱۷. الاقربا (سہ ماہی)، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۶ء

۱۸. الاقربا (سہ ماہی)، اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۱۶ء

۱۹. الاقربا (سہ ماہی)، سالنامہ، ۲۰۱۷ء

۲۰. الاقربا (سہ ماہی)، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۷ء

۲۱. الاقربا(سہ ماہی)، اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۱۷ء

۲۲. الاقربا(سہ ماہی)، سالنامہ، ۲۰۱۸ء

۲۳. الاقربا(سہ ماہی)، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۸ء

۲۴. الاقربا(سہ ماہی)، اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۱۸ء

۲۵. الاقربا(سہ ماہی)، سالنامہ، ۲۰۱۹ء

۲۶. الاقربا(سہ ماہی)، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۹ء

۲۷. الاقربا(سہ ماہی)، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ / جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء

ثانوی مآخذ:

۱. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو جلد اول، ۱۹۵۳، دہلی۔

۲. انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، جنوری ۱۹۹۲ء۔

۳. عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، فن صحافت، کاروان پریس لاہور، ۲۰۰۸ء۔

۴. نثار احمد زبیری، ڈاکٹر، تحقیق کے طریقے، دارالاشاعت مصطفائی، ۲۰۱۶ء۔

۵. وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور احتساب، مکتبہ جدید پریس لاہور، طبع اول، ۱۹۶۸ء۔

۶. عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء۔

رسائل:

۷. (حرف اول) سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۱۹۸۷ء

۸. (اداریہ) سہ ماہی الاقربا، اسلام آباد، جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء۔

لغات:

۹. علمی اردو لغت جامع، وارث سرہندی ایم اے، علمی کتب خانہ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور طبع دوم ۱۷۷۹۔

۱۰. محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔

۱۱. MONEEKA SAREEN,Dictionary of Journalism,IVY publishing House Delhi-110095,ist edition2007۔

۱۲. TONY HARCUP,Oxford Dictionary of journalism,Oxford university press,ist Ed2014۔

۱۳. AlAN BRYMAN,social research methods(4th Edition),Oxford University Press,2012۔

۱۴. JAMES W.DRISKO, TINA MASCHI, Content Analysis, Oxford University Press,2016,

۱۵. Klaus Krippendorf, Content Analysis An Introduction to Its Methodology (Second Edition) Sage Publications International and professional Publisher Thousand Oaks, London, New Delhi,2004,

ویب گاہیں:

1. https://www.merriam-webster.com/dictionary/content%20analysis T,10:34PM,14,11,2021
2. https://www.collinsdictionary.com/dictionary/english/content-analysis,10:37 PM,14/11/2021
3. https://adbimiras.com/ikkiswi-sadi-ki-adabi-sahafat-sheikh-naginvi/ ،25،12،2021، 9:50PM,